سرقے کی روایت تاریخ کی روشنی میں

فارسی، عربی، اردو، یورپی، زبانوں میں سرقوں کی مختصر تاریخ

☆سید خالد جامعی *عمر حمید ہاشمی/سمیہ ایوبی

تشکیل فہرست و تہذیب مقالہ: محمد علی جنید

سرقے کی روایت تاریخ وتحقیق کی روشنی میں

فارسی،عربی،اردواور یورپی زبانوں میں سرقوں کی مختصر تاریخ

سید خالد جامعی

سرقہ، تصرف، افادہ، استفادہ، استفاضہ، اخذ، تقلید، نقل، توارد، یکسانیت، مشابہت، مطابقت، متحد الخیالی، متوازیات [Parallelism] اثر اور امثال سرقہ [نثر و نظم] سے متعلق مباحث علمی وادبی تواریخ کے خصوصی موضوع رہے ہیں۔ لیکن ان مباحث پر کوئی جامع کتاب کم از کم اردو زبان میں ابھی تک نہیں لکھی گئی، مولوی نجم الغنی خان کی بحر الفصاحت[۱]، رسالہ الناظر میں شائع شدہ دستاویز ''سرقہ کا دور محیرہ'' [۲]، ناطق لکھنوی کا مضمون ''سرقہ و توارد'' [۳]، یگانہ کی ''غالب شکن'' [۴]، پنڈت برج موہن کیفی کا خطبہ ''نظر اور خود نظری'' اور منشورات میں ''پہلے ایڈیشن پر نوٹ'' [۵]، عندلیب شادانی کے مضامین سرقہ اور توارد[۶] اور سرقہ یا چوری [۷] ممتاز لیاقت کی بکف چراغ دارد [۸] ان مباحث، اصطلاحات اور موضوعات کا جزوی احاطہ کرتے ہیں لیکن ان الفاظ کے مابین بال سے زیادہ باریک فرق کی تفصیلی وضاحت نہیں کرتے، ترجمہ سرقے میں شامل نہیں اگر ترجمے کا اعتراف کرلیا جائے مگر متقدمین متوسطین اور اکابرین کسی نے بھی ترجمے کا اعتراف نہیں کیا اگر اخذ و استفادہ یا استفاضہ کا اعتراف کرلیا جائے جیسے اقبال کی بیشتر نظموں کے آغاز میں ملتا ہے تو

نوٹ: فارسی اشعار اور جملوں کی تصحیح جدید ایرانی فارسی کے املا کے اصولوں کے مطابق انجام پائی ہے۔

سرقہ کا داغ دھل سکتا ہے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب داغ کو داغ سمجھا جائے، داغ اور اجلا پن مترادف ہو جائیں تو اعتراف گناہ بدتر از گناہ ہو جاتا ہے۔

توارد کم سرقہ بیشتر:

شاعری میں سرقہ اور توارد بالعموم مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ''شاعری میں توارد کم اور سرقہ بیشتر ہے''۔عموماً قدماء نے شاعری میں سرقے کا داغ توارد کے لفظ سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ سرقے اور توارد میں زمین آسمان کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ سارق کی نظر میں بہت کم اور ناقد کی نظر میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔سارقین اور ان کے حاشیہ برداروں نے اپنے دفاع میں ہمیشہ سرقے کو توارد قرار دیا لیکن عامۃ الناس نے توارد کو سرقے کا مترادف یا متبادل کبھی تسلیم نہ کیا۔

اردو زبان نے شاعری کا رنگ ڈھنگ، سانچہ، ڈھانچہ طور اطوار، طریقے سلیقے، اصطلاحات تراکیب، حتٰی کہ مضامین بھی فارسی سے لیے لہٰذا فارسی کی تمام خوبیاں اور خامیاں بھی اردو شاعری کے خمیر اور خمیر میں داخل ہو گئیں۔ فارسی کے اثرات سے سرقے اور کثرت توارد کی روایت بھی اردو شاعری کا مزاج بن گئی۔ ہمارے متقدمین، متاخرین اور اکابرین میں کوئی ایسا نہیں جس کے کلام سے مال مسروقہ برآمد نہ کیا جا سکے۔

سرقے کے دفاع میں:

سارقین کے دفاع میں بعض نادر نکتے بھی پیدا کیے گئے۔مثلاً

''دنیا میں ہر شاعر کم وبیش سرقہ کے الزام سے متہم ہو چکا ہے کیوں کہ وہی انتقال علم وخیال ہے جو مختلف پہلوؤں سے مختلف نام رکھتا ہے۔سرقہ اخذ،نقل،تقلید،ترجمہ،اخذ میں اگر مضمون بہتر نظم ہو جائے یا اس میں بہترین اضافہ ہو جائے یا کوئی اور خوبی ایسی پیدا کر دی جائے جو اصل میں نہ ہو تو ایسا اخذ قابل تعریف ہے۔اردو زبان کی ابتداء میں بکثرت اشعار و مضامین ترجمہ اور نقل کیے گئے ہیں اس کا سلسلہ ولی گجراتی سے غالب ناسخ تک رہا۔[۹]

پنڈت کیفی کے مطابق ''نقد ونظر کی جو درگت اردو میں دیکھی جاتی ہے نقد ونظر کی محتاج نہیں یہ عام کیفیت ہے جو صرف معدودے چند کی مستثنیات مستی تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

اسی ضمن میں سرقہ اور اس کے ملحقات کا الزام بھی آجاتا ہے جن کا قلم یہ فردِ قرارداد ہمارے بہترین شعراء کے خلاف مرتب کرتا ہے۔ وہ حضرات علم نفسیات اور تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جب تہذیب اور کلچر ایک ہو شاعری کا میدان اپنی تنگی یا وسعت میں ایک سا ہو۔ جب تحسین کلام کا معیار اور طرز ادا نہ صرف یکساں بلکہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہو اور ان مسلمہ عوارض میں شاعری کی بنیا د محض تخیل ہو تو تخیل اور مضامین میں مساوات کا ہونا لابد ہے۔ اب اسے چاہے کوئی سرقہ کہے یا ترجمہ، تصرف کہے یا توارد۔''

پریوی کونسل میں سرقہ کا مقدمہ:

پنڈت کیفی اپنے موقف کی وضاحت میں لکھتے ہیں ''اس مقام میں ایک خاص نظیر پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ ہے ایک دیوانی کا مقدمہ کاپی رائٹ [حقوق تصنیف] سے متعلق جو لندن کی پریوی کونسل تک پہنچا۔ مقدمہ کے کوائف آل انڈیا رپورٹر فروری ۱۹۳۲ء مطبوعہ ناگپور میں ملاحظہ ہوں۔ یہاں صرف اس قدر بتایا جائے گا کہ مدعی کا دعویٰ یہ تھا کہ نامور مصنف ایچ جی ولز نے اپنی مشہور عالم کتاب ''آوٹ لائنز آف دی ہسٹری آف دی ورلڈ'' میں مدعی کے مسودہ کتاب سے سرقہ بالجبر کیا ہے۔ پریوی کونسل نے دعویٰ خارج کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ جب دو شخص ایک ہی موضوع پر لکھنے بیٹھیں تو تصنیف وتالیف کا مسالہ، سند، جستجو یعنی ریسرچ کے ذرائع اور طرز بیان یکساں اور ایک ہی ہوں گے۔ اس فیصلہ کا بغور مطالعہ اور اس کے استدلال کا تجزیہ ہمارے بہت سے تنقید کے شیدائیوں کی آنکھیں کھولے گا۔ اور سلف وعہد حاضر کے کئی اچھے شاعروں کے نام پر سے سرقہ کا داغ دھوڈالے گا۔[۱۰]

سرقہ وتوارد:

سرقے اور توارد میں فرق کرنے کے لیے پنڈت کیفی نے ''پریوی کونسل'' کے فیصلے کو سند کے طور پر پیش کیا ہے جو وزنی دلیل نہیں۔ پریوی کونسل کی یہ دلیل کہ طرز بیان یکساں ہوگی سراسر غلط نامعقول اور ناقابل قبول دلیل ہے۔ ہر فرد کا طرز بیان الگ الگ ہوتا ہے خواہ ان تمام افراد کے ماخذات اور طریقہ تحقیق یکساں ہو۔ تاریخ اسلام سے اقبالؔ، شبلیؔ، حالیؔ اور حفیظؔ جالندھری نے بے شمار مضامین و واقعات نظم کیے ہیں۔ لیکن چاروں کے منظومات بغیر نام کے رکھ دیے جائیں تو پڑھنے والا خود بول اٹھے گا کہ یہ نظم کس شاعر کی ہے۔ ہر شاعر اپنی آواز سے پہچانا جاتا ہے یہ آواز اس کی انفرادیت قائم کرتی ہے۔ یہ انفرادیت ختم ہو جائے تو ادب و شاعری کا چمن سونا ہو جائے۔ علامہ کیفی یہ بھول گئے کہ در حقیقت اردو شاعری میں توارد کمتر اور سرقہ بیشتر واقع ہوا ہے۔[۱۱]

سرقہ اور توارد کے درمیان اگر قطعی فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفس خیال میں تو توارد کا بہت امکان ہے لیکن مضمون کے علاوہ دونوں شاعروں کا پیرایہ بیان بھی یکساں ہو اور تشبیہہ واستعارہ بھی جوں کا توں ہے۔ یہ بات تقریباً ناممکن ہے ایسی صورت میں توارد کی بہ نسبت سرقے کا امکان زیادہ ہے،[۱۲]

پنڈت کیفی کے خیال میں ''یہ صحیح ہے کہ محض نقالی یا سرقہ یا توارد یا فرسودگی کا خطرہ غزل میں بہ نسبت نظم کے زیادہ ہوتا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ملتے جلتے مضامین یا متوازیات کس ادب اور کس زبان کی شاعری میں نہیں۔ مضمون میں مشابہت ہونا اور چیز ہے اور فرسودگی پامالی یا سرقہ بالکل دوسری چیز ہے۔''[۱۳]

سرقے کا دفاع کرتے ہوئے مطابقت خیال، یکسانیت مضمون، یا متوازیات [Parallelism] کی خوبصورت اصطلاحات سے سرقے کو توارد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن سرقہ بہر حال سرقہ ہے توارد نہیں۔

شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا نکلے جس نے بقدر استعداد فارسی شعراء کے کلام سے استفادہ نہ کیا، ہو استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں لیکن بدقسمتی سے حضرات شعراء دوسروں کے افکار و مضامین کو اپنا زادۂ طبیعت بنا کر پیش کر رہے ہیں ۔[۱۴]

علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ سرقے کا حکم اسی حالت میں لگایا جا سکتا ہے جب یہ امر یقینی ہو کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے ورنہ اسے توارد کہنا چاہیے ۔[۱۵]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تحقیق کی جائے تو شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جو توارد مضامین سے بچ گیا ہو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام معلومات کا احاطہ فقط ذات باری کے لیے مخصوص ہے ۔شاعر تو اندھیرے میں تیر چلاتا ہے ۔ اسے کیا خبر کہ جو مضمون اس نے باندھا ہے وہ بالکل اچھوتا ہے یا پہلے کہیں بندھ چکا ہے ۔[۱۶]

ابو طالب کلیم نے خوب کہا ہے کہ:

منم کلیم بہ طور بلندی همت
کہ استفادۂ معنی جز از خدا نکنم

ترجمہ: میں بلندی ہمت کے طور پر کلیم ہوں ۔خدا کے سوا اور کسی سے استفادۂ معنی نہیں کرتا ۔

بہ خوان فیض الٰهی چو دست رس دارم
نظر بہ کاسۂ دریوزۂ گدا نکنم

ترجمہ: چوں کہ فیض الٰہی کے خوان تک میری رسائی ہے اس لیے میں فقیر کے کشکول پر نظر نہیں ڈالتا ۔

ولی علاج توارد نمی توانم کرد
مگر زبان بہ سخن گفتن آشنا نکنم

ترجمہ: لیکن توارد کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اس کے سوا کہ میں شعر ہی نہ کہوں۔[۱۷]

سرقے کے دفاع میں غالب کا سرقہ:

غالباً مرزا غالب پر بھی لوگ سرقے کا الزام لگاتے تھے اور چوں کہ وہ کوئی قطعی ثبوت اس امر کا پیش نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے یہاں سرقہ نہیں بلکہ توارد ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مخصوص ذکاہی انداز میں ایک ایسی بات کہی جس نے سرقے اور توارد کا جھگڑا ہی مٹا دیا۔ بلکہ الٹا متقدمین کو سرقے کا مجرم بنا دیا۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

هزار معنی سر خوش، خاص نطق من است

کز اهل ذوق دل و گوی از عسل برده است

ترجمہ: ہزاروں بلند معانی، خاص میرا حصہ ہیں جنھوں نے اہل ذوق کا دل چھین لیا ہے اور جو شیرینی میں شہد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

زرفتگـان بـه یکی گر توارد م رو داد

مدان که خوبی آرایش غزل برده است

ترجمہ: اگر اگلے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے غزل کے حسن میں بٹا لگ گیا۔

مراست ننگ ولی فخر اوست کان به سخن

بـه سعـی فکر رسا جا بدان محل برده است

ترجمہ: یہ بات میرے لیے باعث ننگ ہے لیکن اس کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ اپنی فکر رسا کی کوشش سے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں میری رسائی ہوئی ہے۔

مبـر گمان توارد یقین شناس که دزد

متـاع مـن ز نهان خانهٔ ازل برد است

[تو اس کا گمان نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ چور میرا مال خزانۂ ازل سے چرا لے گیا][۱۸]

متقدمین نے غالب کے مضامین چرا لیے:

یعنی متقدمین کے بعض مضامین اگر غالب کے یہاں پائے جائیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت یہ مضامین ازل میں غالب ہی کے حصے میں آئے تھے۔ وہ لوگ [یعنی متقدمین] وہیں سے چرا لے گئے۔ اب اگر غالب نے مضامین کو اپنے نام سے پیش کیا تو کیا گناہ کیا کیوں کہ دراصل وہ غالب ہی کا مال تھے۔ چوری اور سینہ زوری کی ایسی مثالیں ادبیات میں بہت کم ملیں گی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ غالب کے تینوں شعروں کے مضامین بھی ان کے تخیل کا کمال نہیں بلکہ ملا حسن واعظ کاشفی کی ایک کتاب ''لطائف الطوائف'' میں بیان کردہ ایک واقعہ کا سرقہ ہیں۔ ملا کاشفی نویں صدی ہجری کے ایرانی مصنفین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ''انوارِ سہیلی'' کی بدولت عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔ غالب نے مُلا کی اس حکایت کو شعر کے سانچے میں کفنا دیا ہے۔ ملا کاشفی لکھتے ہیں:

مولانا مظفر در زمان ملکان هرات قصیده گوی زبردست بوده و در اشعار تتبع خاقانی می کرد. در مدح ملک معزالدین حسین قصیدهٔ غرّا گفته. روزی قصیده بر ملک می خواند چون بدین بیت رسید:

شاہان ہرات کے عہد میں مولانا مظفر ایک زبردست قصیدہ گو تھے اور اشعار میں وہ خاقانی کا تتبع کرتے تھے۔ انھوں نے معزالدین حسین، بادشاہ ہرات کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھا۔

زیر قدر قدر او نه قبهٔ خضرا و خور
تودهٔ ای چند از رماد است و درخشان اخگری

ایک دن وہ قصیدہ بادشاہ کو سنا رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے،

''یہ آسمان کے نو گنبد اور آفتاب ممدوح کے مرتبے کے سامنے ایسے ہیں جیسے راکھ کے

ملک بوی تعرض کرده و گفت این را خاقانی در قصیده گفت. خاقانی:

چیست مهر و سپهر با قدرش
اخگری درمیان خاکستر
مولانا بهم برآمد و منفعل شد و گفت "این معنی از من برده" ملک حسین گفت "این سخن چون راست آید و حال آن که خاقانی عمرها پیش از تو وفات یافته" مولانا گفت "ای ملک معانی را که در ازل از مبدا فیاض متوجه روح من بود خاقانی آن را دزدیده بنام خود کرده. ملک بخندید و بران قصیده مولانا را صله لایق داد

چند ڈھیر اور ان میں ایک دہکتی ہوئی چنگاری"۔ بادشاہ نے ٹوکا کہ یہ مضمون تو خاقانی نے ایک قصیدے میں باندھا ہے" ممدوح کے مرتبے کے مقابلے میں آسمان اور سورج ایسے ہیں جیسے راکھ کے اندر چنگاری" مولانا مظفر چڑھ اور جھنیپ کر بولے کہ "خاقانی نے یہ مضمون میرا چرایا ہے" بادشاہ نے کہا یہ کیوں کر ممکن ہے۔ خاقانی تو آپ سے پہلے گزرا ہے"۔ مولانا نے کہا حضور والا! بات یہ ہے کہ جو مضامین ازل میں خدا کی طرف سے میرے لیے مخصوص ہوئے تھے خاقانی نے انھیں چرا لیا اور اپنے نام سے منسوب کر دیا" بادشاہ ہنس پڑا اور اس قصیدے پر مولانا کو معقول انعام دیا۔ [۱۹]

غالب کا سرقہ ثابت شدہ ہے:

غالب نے سرقہ کیا اور سرقے کی توجیہ پیش کرنے کے لیے خیال آفرینی فرمائی تو اس کے لیے بھی مولانا مظفر کے دلائل کا سرقہ کر کے شعروں میں سمو دیا۔

غالب کی یہ دیدہ دلیری کہ ان کے مضامین ان سے پہلے آنے والوں نے چرا لیے ہیں محض شاعرانہ تعلی کے سوا کچھ نہیں، اس تعلی کے باوجود ان کا سرقہ ثابت شدہ سرقہ ہے۔ اسے توارد سمجھنا محض غالب پرستی ہے۔ مشفق خواجہ کی روایت کے مطابق ماہنامہ اردو زبان

میں شمیم احمد نے غالب کے پانچ سو سرقہ شدہ اشعار پر مضمون لکھا۔ یہ مضمون سر دست سامنے نہیں ہے لیکن مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی بیاض ہماری تحویل میں ہے جس میں غالب کے تین سو اردو و فارسی اشعار کا بیدل سے سرقہ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ بیاض جلد شائع ہوگی۔

ناطق کی عجیب وغریب دلیل:

سرقے کے دفاع میں ایک زبردست دلیل ناطق لکھنوی نے پیش کی ہے۔

''اگر چہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شاعر تمام دنیا کے شعراء کا کلام دیکھے اور یاد رکھے مگر چوں کہ یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ جب کوئی شعر شائع اور مشہور رہے تو اس سے سرقہ کیا گیا ہوگا۔ اس لیے صفائی ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر اس اتہام سے بری نہ ہوسکا......... اردو زبان میں شاعری کی ابتداء بھی اسی طرح ہوئی کہ فارسی اشعار کے بکثرت ترجمے کیے گئے لہٰذا اگلے زمانے کے شعراء اس امر میں قابل اعتراض نہیں ہیں اور جس طرح اُس زمانے کی بہت سی باتیں متروک ہوگئی ہیں یہ بات بھی ترک کر دی گئی ہے اور اب عیوب میں داخل ہے۔[۲۰]

میں سرقہ یا توارد یا اخذ یا تقلید یا نقل وترجمہ کے تنوعات دکھا کر ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ عیب جس طرح غیر مادی ہیں الزام بھی غیر مادی اور غیر مدلل ہے لہٰذا چند وجوہ سے اس قصور کو عیوب شعر سے خارج کر دینا چاہیے اور ان مختلف الاثر صورتوں کو سرقہ کے تحت میں لا کر کسی کی تشہیر کرنا زیبا نہیں جیسا کہ آج کل اس قسم کے مضامین بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس عیب سے دنیا میں کوئی شاعر خصوصاً متاخرین میں سے ایک بھی نہیں بچ سکتا اس کو عیب ہی نہ کہنا چاہیے۔ جس عیب سے دنیا میں کوئی شاعر خصوصاً متاخرین میں سے ایک بھی بچ نہیں سکتا اس کو عیب ہی نہ کہنا چاہیے۔ اکثر مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ گو ہر انسان گناہ گار ضرور ہوتا ہے، مگر نیکی وبدی کا توازن اور اندازہ بھی ہوگا جس کی برائیاں وزن میں زیادہ ہوں گی وہی قابل سزا وملامت ٹھہرے گا۔ یہاں یہ ہے کہ الزام سرقہ ہر شاعر پر عائد ہوسکتا ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں اتنے قیود ہیں کہ دنیا کی کسی شاعری میں اتنی جکڑ بندیاں نہیں، اس لیے عیوب واغلاط اور نقائص کا کچھ شمار ہی نہیں۔ ان سب پر طرہ یہ کہ اور عیبوں سے اگر بچ گیا تو سرقہ کے الزام سے بری نہیں ہو سکتا تو شعر کہنا کیا ہوا کہ اٹھارہ ہزار عالموں کا عذاب میں گرفتار ہونا ہوا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مادہ نکتہ چینی اور رشک دلی کا ہے کسی اور ملک میں نہیں۔ یہاں ایسے نقادوں کے لیے اسلحہ کی فراوانی پیدا کرنا مظالم کا ایک مینہ برسانا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب سرقہ کا ملزم مشتبہ ہے اور تو ارد کا امکان کئی صورتوں سے ہے۔ مثلاً شعر نہیں دیکھا یا دیکھا اور سنا تو مگر یاد نہیں رہا تو اس شبہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیے۔

پانچویں وجہ ان سب سے بڑی یہ ہے کہ تمام دنیا کے اشعار کا علم ہونا اور پھر سب کو یاد رکھنا خصوصاً شعر کہنے کے وقت جب کہ شاعر ایک ایسے وجدان کی حالت میں ہوتا ہے جس کو انتہائی ہوشیاری اور انتہائی بے ہوشی کا بین بین کہنا چاہیے۔ ناممکن اور قوت انسانی سے باہر ہے اور شاعری جب کہ ایک ہی اصول پر اور ایک ہی منزل پر پہنچتی ہے تو پھر تو ارد نہ ہونا امر فطری کے خلاف ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ لاکھوں آدمی ایک ہدف پر اپنے اپنے تیر مختلف مقامات سے پھینکیں اور کوئی تیر بھی ایک نقطے پر نہ بیٹھیں۔ میرے خیال میں ناوک خیال کا متحد الوقوع ہو جانا ایک امر ناگزیر ہے۔[۲۱]

اس دلیل کو ''مدلل مداحی'' کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، ناطق یہاں سخن فہم بننے کے بجائے سارقین کے طرف دار بن گئے ہیں۔ ناقد فریق بن جائے تو اس کا نقد عقیدہ بن کر ایک خاص طبقے کی ترجمانی بن جاتا ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں ناطق نے ہر شاعر کو سرقہ کی اجازت عام عطا کر دی ہے۔ کثرت گناہ، گناہ کو گناہ کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتا۔ یہ فلسفہ تو مغرب کا ہے جس کی بنیاد جمہوریت اور جمہور کے اکثریتی فیصلے پر رکھی گئی ہے کہ کثرت رائے سے حق و باطل کا تعین خود کیا جا سکتا ہے اصلاً کوئی چیز خیر یا حق نہیں ہے انسانوں کی

اکثریت جس نقطۂ نظر کو قبول کرے وہی خیر یا حق ہے۔ یہ خیر اور حق ہر زمانے میں حالات و زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، خیرِ مطلق یا مطلق حق کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر شاعری میں مغربی جمہوری رویہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اعلیٰ درجے کا چور یا باکمال شاعر:

دنیا بھر کے شعراء، محققین اور ناقدین کا اجماع ہے کہ چوری میں کمال شاعر کو سارق کے اسفل ترین درجے سے اٹھا کر باکمال شاعر کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

اربابِ فن کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ اگر کوئی شاعر دوسرے کا مضمون لے کر ایسا شعر کہے کہ پہلے شعر سے بڑھ جائے تو پھر یہ سرقہ موردِ ملامت نہیں بلکہ سزاوارِ تحسین ہے[۲۲] چناں چہ مولانا جامی نے بہارستان میں سلمان ساوجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سلمان ساوجی نے دوسرے اساتذہ خصوصاً کمال اسماعیل کے اکثر مضامین کو اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ چوں کہ سلمان کے اشعار حسن و خوبی میں اپنے اصل سے بڑھ گئے ہیں اس لیے وہ قابلِ ملامت نہیں۔ قطعہ:

معنی نیک بود شاهد پاکیزه بدن

که به هر چند درو جامه دگرگون پوشند

ترجمہ: خوبصورت مضمون ایک پاکیزہ بدن شاہد کے مانند ہے۔ چاہے اسے کیسا ہی لباس پہنا دیں۔

کسوت عار بود، باز پسین خلعت او

گر نه در خویش از پیشتر افزون پوشند

ترجمہ: اب اگر دوسرا لباس پہلے لباس سے بہتر نہیں ہے تو یہ دوسرا لباس اس کے

لیے باعث ننگ وعار ہے۔

هنر است این که کهن خرقۂ پشمین زیرش
بدر آرند و درو اطلس و اکسون پوشند

[یہ بھی ایک ہنر ہے کہ اس کی کمبل کی گدڑی اتار کے، اسے ریشم واطلس کے کپڑے پہناویں] ۔[۲۳]

اسی خیال کو علامہ آزاد بلگرامی نے ایک شعر میں نظم کردیا ہے اور وہ یہ ہے:

شاهد معنی که باشد جامۂ لفظش کهن
نکته دانی گر حریر تازه پوشاند خوش است

[شاھد معنی جس کا جامۂ الفاظ پرانا ہو، اگر کوئی نکتہ سنج اسے ریشم کا نیا لباس پہنا دے تو کیا کہنا:

لہٰذا اگر یہ امر تحقیق بھی ہو جائے کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے تب بھی ملامت میں عجلت خوب نہیں ۔[۲۴]

خوبصورت چوری عیب نہیں :

پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زیر بحث شعر حسن وخوبی میں اپنی اصل سے بڑھ گیا یا نہیں ۔اگر بڑھ گیا تو یقیناً قابل تعریف ہے ۔ مستحق ملامت نہیں ۔آخر اس نے کچھ تو اضافہ کیا۔ دنیا کی ہر چیز میں ترقی کا یہی اصول کارفرما ہے اور شعر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا ۔[۲۵]

سرقہ صنعت شعری ہے :

عبدالوسع ہانسوی نے اپنے رسالے میں سرقے کے عیب کو صنعت سرقۂ شعری لکھا ہے، سبحان اللہ یہ کیا عمدہ صنعت ہے کہ دوسرے کا شعر یا مضمون یا الفاظ چرالیں ۔[۲۶]

سرقے کے جواز میں پیش کیے گئے دلائل نے شاعروں کا خون بڑھلایا اور سرقے

کی رسم، اردو شاعری اور نثر سے آکاس بیل کی طرح چمٹ گئی۔

اعلیٰ درجے کا چور باکمالوں میں شامل ہو جاتا ہے لیکن اگر سارق درجہ کمال تک پہنچنے میں دو چار ہاتھ رہ جائے تو وہ اول درجے کا سارق نقال اور قابل گردن زدنی بن جاتا ہے۔شعر و شاعری کی دنیا ایک الگ دنیا ہے۔اس کا دستور بھی سب سے نرالا ہے۔سرقے کی بہ حسن و خوبی تکمیل پر اعزاز فضیلت عطا ہوتی ہے۔یہ کام احسن طریقے پر تکمیل پذیر نہ ہو سکے تو خلعت واپس لے لیا جاتا ہے اور اسے بدترین چور اور اس کی شاعری کو بدترین سرقہ قرار دیا جاتا ہے۔[۲۶]

سرقے کی اقسام

سرقے کی دو اقسام ہیں سرقہ ظاہر اور سرقہ غیر ظاہر ان کی ذیلی اقسام بھی ہیں۔ حکیم نجم الغنی خان نے بحر الفصاحت میں ان اقسام کی تفصیل تحریر کی ہے جو ذیل میں درج ہے:

سرقہ ظاہر

۱۔ سرقہ ظاہر وہ ہے کہ اگر دونوں شعروں کو کسی عاقل کو سنایا جائے تو وہ حکم لگا دے کہ ان میں سے ایک اصل دوسرا بشرطیکہ اس لفظ کو جو غرض و وصف پر دلالت کرتا ہو تمام آدمی نہ جانتے ہوں ایک انتحال و نسخ یعنی کسی کے کلام کو بغیر اختلاف و معانی کے اپنا کرلیں غالب کے یہاں ایسی مثالیں بہت ہیں۔[۲۷] پروفیسر شمیم احمد مرحوم نے غالب کے ایسے سو مصرعوں کی نشاندہی قومی زبان کے ''غالب نمبر'' میں کی ہے جو غالب سے سو برس پہلے کے شاعر فغاں دہلوی کے یہاں من وعن ملتے ہیں۔قومی زبان غالب نمبر دو، جلد سردست حوالہ میسر نہیں۔

۲۔ دوسری قسم سرقے کی مسخ اور اغارہ ہے یہ اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص کے کلام کے تمام لفظ و معنی لے کر صورت کلام کی بدل دیں یعنی ترکیب الفاظ میں تغیر و تبدل کر دیں یا بعض الفاظ لیں تمام الفاظ نہ لیں۔[۲۸]

۳۔ تیسری قسم سرقے کی سلخ اور المام ہے یعنی پرائے مضمون ومطلب کو اور الفاظ میں باندھنا اس کے الفاظ چھوڑ دینا۔[۲۹]

سرقہ غیر ظاہر:

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تحقیق کے مطابق سرقۂ غیر ظاہر اسے کہتے ہیں کہ اگر دو شاعروں کے شعر کسی عاقل کو سنائے جائیں تو وہ ان کے سننے کے بعد اس بات کا حکم کرنے میں کہ ایک کی اصل دوسرا ہے تامل وغور کی طرف محتاج ہو اگرچہ سرقۂ غیر ظاہر میں بھی پہلے شاعر کے معنی دوسرا شاعر لیتا ہے لیکن اس میں یہ بات مخفی ہوتی ہے کہ دوسرے نے پہلے سے معنی لیے ہیں، بخلاف سرقۂ ظاہر کے اس میں یہ امر خوب ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے معنی سے دوسرے معنی لیے گئے ہیں اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔[۳۰]

ایک قسم یہ ہے کہ کوئی شاعر ایسا شعر لکھے کہ اس کا مضمون دوسرے شاعر کے شعر سے مشابہت رکھتا ہو اور شاعر ماہر وہ ہے کہ مشابہت کے اخفا میں کوشش کرے اس طرح کہ شعر کی زمین بدل دے اور مضمون بھی بدل دے اس طرح کہ اگر پہلے کا شعر مدح میں ہو تو ہجو میں لکھے اور اگر پہلے کا شعر مرثیے میں ہو تو تہنیت کے موقع پر لائے۔

تیسری قسم سرقہ غیر ظاہر کی یہ ہے کہ کسی خاص مضمون کو ایک محل سے دوسرے محل میں نقل کریں یعنی وہ خاص مضمون ایک شاعر نے کسی اور موقع پر لکھا تھا دوسرا اس کو کسی اور موقع پر لائے۔

چوتھی قسم سرقہ غیر ظاہر کی یہ ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے کلام کی ضد ہو۔

سرقہ غیر ظاہر کی قسمیں بلغا کے نزدیک مقبول ہیں بلکہ سرقے کا اطلاق ان پر نا روا ہے۔[۳۱]

سرقہ و توارد:

''یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جب تک پورا پورا حال معلوم نہ ہو جائے تب تک سرقہ

نہ کہیں اور یہی حال ہماری مثالوں کا ہے چناں چہ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ سرقے کا حکم اس وقت کرنا چاہیے جب کہ ثانی کا اخذ اول سے یقینی ہو ورنہ سرقے کے احکام مترتب نہیں ہو سکتے۔ توارد کے قبیل سے ہوگا اور جس صورت میں کہ ثانی کا اخذ اول سے معلوم نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ فلاں شاعر نے یوں کہا ہے اور دوسرے نے سبقت کر کے اس طرح پایا ہے کیوں کہ اس حسن تعبیر سے فضیلت صدق کی ہاتھ سے نہ جائے گی اور علم غیب کے دعوے اور غیر کی طرف نقص کی نسبت کرنے سے بھی محفوظ رہے گا۔ اگر نظر تفتیش سے ملاحظہ کیا جائے تو توارد مضامین سے خالی کم شاعر پائے جائیں گے اس لیے کہ احاطہ جمیع معلومات کا علم الٰہی کا خاصہ ہے۔ معنی نگار کا خامہ اندھیرے میں تیر چلاتا ہے کیا جانے کہ صید وارستہ ہے یا بال و پر بستہ ہے۔ کلیم نے خوب گوہر انصاف پروئے ہیں۔

منم کلیم بہ طور بلندی ہمت　　　　که استفادهٔ معنی جز از خدا نه نکنم

بخوان فیض الهی چو دسترس دارم　　　　نظر بکاسهٔ دریوزه گدا نه نکنم

ولی علاج توارد نمی توانم کرد

مگر زبان به سخن گفتن آشنا نکنم

ملحقات سرقہ:

بحث سرقہ کے ملحقات میں سے تضمین اور اقتباس اور عقد وحل ہوا اور ان کے سرقہ کے ملحق ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ان میں بھی کلام سابق کے معنی کو کلام لاحق میں داخل کیا جاتا ہے۔

تضمین اور سرقہ:

تضمین اسے کہتے ہیں کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا پورا شعر یا مصرع کا ٹکڑا لے کر اپنے کلام میں باندھے اور اس کا نام بھی لکھ دے اور اس طرح نام لے دینے سے کوئی سرقے کا گمان نہیں کرتا، کبھی پورے شعر اور اس سے زائد کی تضمین کو استعانت کہتے ہیں اور مصرع

اور مصرع سے کم کی تضمین کو ایداع اور رفو بولتے ہیں اور اگر تضمین میں تھوڑا سا تصرف بھی کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر تغیر کثیر مضر ہے کیوں کہ تضمین سے نکل کر حد سرقہ میں داخل ہو جائے گا۔[بحر الفصاحت ص ۱۲۸۳ تا ۱۱۵۴]

سرقے کی بدترین قسم:

سب سے بدترین صورت سرقہ کی یہ ہے کہ مضمون یا کوئی چیز لینے کے بعد بھی شعر اس کے برابر نہ ہو سکے بلکہ ترجمہ اگر ناقص ہے تو سرقہ کے برابر ہے۔آتش نے ایک شعر میں سرقۂ شعری کی برائی کی ہے اور شاید روئے سخن ناسخ کی طرف ہے کیوں کہ ناسخ سرترجمے کیا کرتے تھے اور آتش کا یہ رنگ نہ تھا۔

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں چکھی خراب کرتی ہے مال حرام کی آتش[۴۸]

چوروں کے ضمن میں نقادانِ سخن کے رویے اس نادان کی یاد دلاتے ہیں جو خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔اگر کامیاب ہو جائے تو بامراد ہوتا ہے اور اگر کوشش ناکام ہو جائے تو تعزیرات پاکستان کے تحت گرفتار کر کے فوجداری مقدمہ میں ماخوذ کر لیا جاتا ہے۔اسے مرنے کی صورت میں کوئی سزا غالباً اس لیے نہیں دی جاتی کہ موت خود سب سے بڑی سزا ہے۔زندہ بچنے کی صورت میں سزا شاید اس لیے دی جاتی ہے کہ مرنے کی تیاری بھرپور طریقے سے کیوں نہیں کی تھی لہٰذا سزا بھگتو۔ادب اور ضابطہ فوجداری کے قواعد و قوانین مرتب کرنے والوں کی ذہنی مطابقت اور یکسانیت حیران کن ہے۔[۴۹]

فارسی میں سرقے کی روایت:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اردو شاعری فارسی کے غلبے سے آزاد ہونے لگی اور انگڑائی لے کر اپنی ادائیں دکھانے لگی، لیکن بنیادی طور پر اس کا سانچہ اور ڈھانچہ فارسی سے مستعار تھا لہٰذا سرقے کی روایت جو فارسی میں بہت مستحکم تھی اردو شاعری اور شعراء کے مزاج میں خود بخود دخیل ہو گئی۔

جامی اور انوری، علی حزین اور مولانا روم، تشبیہی کاشی اور مولانا جامی، حزین اور حیرتی خواجہ عزیز الدین کشمیری اور اثر شفیعائی شیرازی، بابا فغانی اور خسرو، نظیری نیشاپوری اور نصیر الدین چراغ دہلوی کے اشعار میں سرقے کی وارداتیں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ مثالیں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں اور صرف مضامین میں ہی نہیں بلکہ پورے پورے اشعار اور تمام و کمال غزلیں متوارد موجود ہیں۔[۳۰]

مکمل غزل کا سرقہ:

مثلاً ایک غزل جو خواجہ حافظ شیرازی کے بھی دیوان میں ہے اور سلمان ساوجی کے کلیات میں بھی لفظ بلفظ جلوہ فرما ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے کہ:

زباغ وصل تو یابد ریاضِ رضواں آب　　نہ تاب ہجر تو وارد شرارِ دوزخ تاب

فارسی شعراء کے سرقے:

مولانا جامی کا یہ شعر مشہور ہے:

جانِ تنِ فرسودہ رابا غمِ ھجران گذاشت
طاقتِ مہمان نداشت خانہ بہ مہمان گذاشت

اور اب انوری کا شعر پڑھیے

مرا خدنگ تو مہمان خانۂ بدن است
کسی کہ خانہ بہ مہمان گذاشت جانِ من است

علی حزیں کا یہ مصرع مشہور ہے ''بہ پستاں آمدن خونِ جگر را شیر می سازد''
اور مولانا روم کا یہ مصرع کس کو یاد نہیں ہے ''مدتے بایست تا خوں شیر شد''
تشبیہی کاشی ایک لاجواب شاعر تھا اس کا شعر ہے:

کفِ پا بہ ھر زمینی کہ رسد تو نازنین را
بہ لبِ خیال بوسم ھمہ عمر آن زمین را

اور اسی مضمون کا شعر جو اس کا ماخوذ عنہ ہو سکتا ہے۔ مولانا جامی آج سے چار سو برس پہلے کہہ چکے ہیں:

چو نتوانم کہ بوسم لعلِ رخشش　　بہ ھر جا بگذرد بوسم زمین را

حزیں کا ایک ہم عصر حیرتی تھا دونوں کے شعر ملاحظہ ہوں:

حزیںؔ:

ای وای بر اسیری، صیاد رفته باشد　　درد ام مانده باشد صیاد رفته باشد

حیرتیؔ:

ماند در زلفِ تو دل وای بر آن صیدِ اسیر　　که بدام افتد و از خاطرِ صیاد رود

خواجہ عزیز الدین کشمیری ثم لکھنوی کو کون نہیں جانتا، فارسی زبان اور قادر الکلامی میں ہر ایرانی ان کو جواب نہیں دے سکتا، ان کا ایک شعر نعت میں ضرب المثل ہے۔

دهد حق عشقِ احمد بندگانِ چیدهٔ خود را

به خاصان شاه می بخشد می نوشیدهٔ خود را

مگر ان سے دوسو سال پہلے آزؔ شفیعائی شیرازی جو کچھ کہہ گیا ہے وہ بھی سنیئے

دوستان را کسوتِ تجرید پوشاند خدا　　شاه می بخشد به خاصان خلعتِ پوشیده را

بابا فغانیؔ کی بابت تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وحشیؔ، حکیم ثنائی، رکن مسیح، عرفیؔ اور شفائیؔ ایسے شعرا اس کے متبع اور مقلد تھے ان کا ایک مطلع ملاحظہ ہو:

خوبی همین کرشمه و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوه هاست بتان را که نام نیست

اور اب خسروؔ کا بھی یہ شعر پڑھیے معلوم ہوتا ہے کہ اسی تخم کا وہ درخت ہے:

ورای حسن، بربروی تو چیزیست　　که آن را کس نمی دا ندچه نام است

نظیریؔ نیشاپوری کے تعارف کی ضرورت نہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو:

می گریم و از گریه چو طفلم خبری نیست　　دردل هو سی هست ندانم که کدام است

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی جو کہ نظیری سے تقریباً دو سو برس پہلے تھے ان کا یہ شعر ہے:

گه شادم و گه غمگین از حال خودم غافل

گه گریم و گه خندم چون طفل به خواب اندر

ایسی ہزاروں مثالیں ہیں اور صرف مضامین ہی نہیں بلکہ پورے پورے اشعار اور

تمام وکمال غزلیں متوارد موجود ہیں ۔[۳۱]

تاریخ سے یہ بات بارہا ثابت ہے کہ توارد شاذ ونادر اور سرقہ اکثر وبیشتر واقع ہوتا ہے ۔اگر چہ سرقہ کرنے والا اپنی چوری کھل جانے کے بعد ہمیشہ اسے توارد ہی سے تعبیر کرتا ہے ۔

میر صاحب نے ولی دکنی کا ذکر کرتے ہوئے ''نکات الشعرا'' میں لکھا ہے کہ ''ولی دہلی بھی آئے تھے ۔جب وہ میاں گلشن صاحب سے ملنے گئے اور اپنے کچھ اشعار انھیں سنائے تو میاں صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے یہ تمام مضامین بے کار پڑے ہوئے ہیں ۔انھیں اپنے ریختے میں نظم کرلو۔کون تم سے باز پرس کرے گا''۔

ولی نے میاں گلشن صاحب کے اس مشورے پر کس حد تک عمل کیا ہمیں معلوم نہیں لیکن شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جس نے بقدر استعداد فارسی شعراء کے کلام سے استفادہ نہ کیا ہو حتیٰ کہ ہمارے مشاہیر اساتذہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ۔[۳۲]

شعرائے اردو میں فارسی زبان سے طبعی مناسبت اور ادبیات فارسی کا گہرا مطالعہ مرزا غالب کی طرح شاید کسی دوسرے کا نہ تھا۔ہندوستانیوں میں بیدلؔ اور ایرانیوں میں نظیری وظہوری وغیرہ کا رنگ ان کے کلام میں صاف طور پر جھلکتا ہے اور ان کے یہاں ایسے متعدد اشعار پائے جاتے ہیں جو کلیتاً یا کسی حد تک فارسی اشعار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔

امیر خسرو نے محمد سلطان بن غیاث الدین بلبن کے شہید ہونے پر جو مرثیہ لکھا تھا اور جو ان کی شہرت کا پہلا سبب ہوا اس میں ایک شعر یہ ہے:

بسکہ آبِ چشمِ خلقی شد روان در چار سو　　　پنج آبی دیگر اندر مولتان آمد پدید

ناسخ کہتے ہیں:

ایک ترچھی ہے وہ آنکھیں مری　　　اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

بیدلؔ:

مسی آلوده بر لب رنگ پان است　　تماشا کن تہِ آتش دخان است

ناسخؔ:

مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہے　　تماشا ہے نہ آتش دھواں ہے

ناصرعلیؔ:

گویند که شب برسرِ بیمار گران است　　گر سرمه به چشمِ تو گران است ازان است

علی حزیںؔ:

بوریا جای من و جای تو نگر قالین　　شیرِ قالین دگر و شیرِ نیستان دگر است

ناسخؔ:

فرق ہے شاہ وگدا میں قولِ شاعر ہے یہی　　شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

اصلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ناسخ وغالب دونوں یہ چاہتے تھے کہ فارسی کی روح کو اردو قالب میں ڈھالیں، چناں چہ غالب کے اردو دیوان میں بکثرت ایسے اشعار ہیں جن میں فارسی اشعار سے مضامین لیے گئے ہیں اور جس شعر کا کوئی حصہ ہندوستان کے مذاق سے علیحدہ ہے اس حصے کو بدل دیا ہے۔ اس رد و بدل نے غالب کی اردو شاعری میں اردو کی ادبیت کے لحاظ سے ایک بدرنگی پیدا کر دی ہے اور صدہا شعر ایسے ہیں جن میں خیال و تخیل تو بہت بلند و نازک ہے مگر کیفیت شعری سے معرا ہیں۔ اس عیب کو غالبؔ نے خود بھی محسوس کیا ہے اور کہا ہے:

بگذر از مجموعۂ اردو که بیرنگِ من است [۳۴]

اساتذہ کے سرقے:

مضمون کی چوری ہمارے اساتذہ کی ایک پرانی عادت ہے۔ مرزا غالبؔ رئیس المتغزلین حسرتؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، میر تقی میرؔ، اسیرؔ، سراجؔ دکنی، جگرؔ مرادآبادی کے

سرقے پیش کیے جاتے ہیں ۔[۳۴]

میر کے اس شعر کو:

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں   جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں

امیرؔ نے اس طرح ''مسخ'' کیا ہے:

جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں   کہیو قاصد کہ دعا کرتے ہیں

یا مثلاً میر کے اس شعر کو:

اے بتو اس قدر جفا ہم پر   عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

شیریںؔ [بیگم صاحبہ بھوپال] نے اس طرح اپنا بنا لیا ہے:

نہ کرو اتنی ہم پہ جور و جفا   اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

میرؔ کا ایک مشہور شعر:

یہ کہتے وہ کہتے ہمؔ یہ کہتے جو یار آتا   سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مگر دراصل یہ امیر خسرو کا مال ہے:

بدل گویم که اینها خواهشی گفت   چو او پیش نظر آید زبان کو

سراج دکنی فرماتے ہیں:

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی   جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

دراصل یہ مضمون قاسم ہی کا زادۂ طبیعت ہے:

بروز هجر مرا دیده بس گهر بار است   شبی که ماه نبا شد ستاره بسیار است

انعام اللہ خاں یقین کا ایک شعر ہے:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند

برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا

ان بزرگوار نے بھی فارسی کے ایک شعر کو ''غارت'' کیا ہے۔

اصل یہ ہے:

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل   بندِ قبای کیست کہ وا می کنیم ما

مرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

مگر یہ بھی پرایا مال ہے۔ جلالؔی یزدی کہتا ہے:

از شوق تو صد بوسہ زنم بردہنِ خویش   ہر گاہ کہ نامِ تو بر آید ز زبانم

میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں کرم اللہ خان دردؔ کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو

پلک لگنے کی لذت دیدۂ پر آب کیا جانے

تحقیق سے پتہ چلا کہ دردؔ صاحب یہ "دیدۂ پر آب" کا سمندر فرقتی جوشقانی کی آنکھ بچا کر اڑا لائے ہیں۔

فرقتی:

چہ شد اگر مژہ برہم نمی توانم زد   کہ لب بہ لب نہ رسید است ہیچ دریا

ابوالحسن تانا شاہ، بادشاہ دکن کے مقربین میں سے ایک بزرگ گزرے ہیں۔ ابوالقاسم نام مرزاؔ تخلص، ان کا یہ مقطع ہے:

مرزاؔ وہ نونہال چمن مٹ گئے کدھر   لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

اب اس کا ماخذ دیکھیے

ز غارتِ چمنت بر بہار منّت ہاست   کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

غرض یہ حضرات فارسی اشعار کو اپنی ملکِ موروث سمجھتے تھے اور جو شعر پسند آتا تھا بڑے اطمینان کے ساتھ اس پر متصرف ہو جاتے تھے۔

نسیم نے اس مضمون کو لے کر اپنے الفاظ میں اس طرح باندھا ہے:

مقرر بلا آنے والی ہے کوئی　　نہیں بے سبب مہربانی تمہاری

سرقاتِ حسرتؔ:

حسرتؔ:

ہمیں اب یاں سے دیکھیں اٹھاتا ہے کون　　درِ جاناں پہ دھونی رما بیٹھے

غالبؔ:

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد　　اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

حسرتؔ:

وہ جفا کار اور وفا حسرتؔ　　تیرے ابتک نہیں مزاق میں فرق

حسرتؔ:

مل چکی ہم کو ان سے دادِ وفا　　جو نہیں جانتے لگی دل کی

غالبؔ:

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرتؔ:

کافی تھی مجھے دُردِ تہہ جام بھی حسرتؔ　　کاسہ جو مرا سے وہ لبریز نہ کرتے

غالبؔ:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ　　ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

حسرتؔ:

مل گیا اچھا سہارا عذر ہستی کا ہمیں　　لے لیا آغوش میں اس گل کو بے باکانہ آج

غالبؔ:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

حسرتؔ:

چھیڑ ناحق نہ اے نسیم بہار سیر گل کا یہاں کسے ہے دماغ

غالبؔ:

فراقِ یار میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو کسے دماغ یہاں خندہ ہائے بے جا کا

حسرتؔ:

شرح بے مہری احباب کروں کیا حسرتؔ رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

غالبؔ:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہیں

حسرتؔ:

جان کر مجھ پر ستم بھی ہو تو ہے منظور شوق

لطف بے پرواہ کی میں کیا قدر کیوں پروا کروں

غالبؔ:

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

حسرتؔ:

ہے غضب اس شہسوارِ حسن کا فتراک ناز دل ہے جس میں اک شکارِ نیم جانِ اضطراب

غالبؔ:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

حسرتؔ:

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا کیا ہوگا مگر ہجر میں تا عید اثر تک

غالبؔ:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پچیس XXV

حسرتؔ:

نہ چھپتا مجھ سے تو کا ہے کو رازِ عاشقی کھلتا

انھیں باتوں سے میں رسوا ہوں ظالم تو بھی رسوا ہے

غالبؔ:

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

حسرتؔ:

ٹھہرا ہے اک نگاہِ کرم پر معاملہ اے لطفِ یار مفت ہے جنسِ گرانِ دل

قلقؔ:

ادا سے دیکھو لو جاتا رہے گلہ دل کا بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

حسرتؔ:

پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں تیری نسبت سے آفتاب ہوا

لاعلم

گرچہ خردیم نسبتی است بزرگ زرۂ آفتـــــاب تـــــابـــــانیـــم

حسرتؔ:

ہو گیا راہِ عشق میں جو شہید وہ فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوا

حافظؔ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدئہ عالم دوامِ ما

حسرتؔ:

عذرِ ستم ضرور نہ تھا آپ کے لیے حسرت کو شرمسارِ ندامت نہ کیجیے

لاعلم

شرمندہ ام کردی مگو عذر جفازین بیشتر من از تو این مقدار ہم آزردہ خاطر نیستم

حسرتؔ:

اس غم طلبی کی کوئی حد بھی ہے کہ حسرتؔ ‏ ‏ بے چین ہوئے ہم جو ہوا دردِ جگر بند

حسرتؔ:

زندگی درد پہ موقوف ہے اے چارہ گرو ‏ ‏ یہ مری موت کے ساماں ہیں کہ درماں کی صلاح

نواب صفدر علی خان رامپوری

میرا مدار زیست ہی صفدرؔ تڑپ پہ ہے ‏ ‏ مر جاؤں ایک دم جو نہ ہو بے قرار دل

حسرتؔ:

بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی سر راہ ‏ ‏ گزرے ادھر سے شاید وہ ذیجاہ

خواجہ غلام غوث بے خبر:

بخت کجاست بی خبر تا بر کابِ او دوم ‏ ‏ بر سرِ رہ نشسته ام نیم نگاهم آرزوست

حسرتؔ:

کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم ‏ ‏ آئے تھے ان کی زیارت کو بڑی دور سے ہم

حسرتؔ:

آئے تھے محفل میں تیری باہزاراں آرزو ‏ ‏ یا چلے ہیں ایک لے کر خاطرِ باشاد ہم

عرفیؔ:

از در دوست چه گویم به چه عنوان رفتم ‏ ‏ همه شوق آمده بودم همه حرمان رفتم

حسرتؔ:

اہل نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار ‏ ‏ اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز

حافظؔ:

خوبی همین کرشمه و ناز و خرام نیست ‏ ‏ بسیار شیوه هاست بتان را که نام نیست

حسرت:

آئی جو ترے روئے منور کے قریں شمع　　ہم لوگ یہی سمجھے کہ محفل میں نہیں شمع

خواجہ میر درد:

رات محفل میں ترے حسن کے شعلہ کے حضور　　شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

حسرت:

دیکھئے شوقِ شہادت کہ جھکی ہے گردن　　آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

مشتری:

ہم جھکائے ہوئے ہیں دیر سے سر　　آپ خنجر لگایئے تو سہی

حسرت:

دور ہم ان کی بزم سے جیتے رہے تو کیا رہے

آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا

لاعلم

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں

خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں

حسرت:

ارادے تھے کہ ان سے حالِ دل سب ملکے کہدیں گے

مگر ملنے پہ ہم سب آج ہوتا ہے نہ کل کہنا

میر:

یہ کہتے وہ کہتے ہم یہ کہتے جو یار آتا　　سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

حسرت:

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر　　یہ دیکھئے مناسب شانِ عطا ہے کیا

خیام:

من بدکنم و تو بد مکافات دھی　　پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

حسرت:

مجبور مجھ کو جان کے عہد وفا کے بعد　　بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد

حسرت:

وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھ کو　　سمجھ لیا ہے جو مجبور آرزو مجھ کو

حسرت:

مجبور وفا کر کے محروم کرم کرنا　　بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

شہیدی:

وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو

یہ سن رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے

حسرت:

ضبط رازِ عشق نے رخصت نہ دی فریاد کی

آ کے لب تک رہ گئے شکوے تری بیداد کے

داغ:

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری　　لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

حسرت:

یہ آج ہم سے جو چاہت جتائی جاتی ہے　　عدو سے ملنے کی خفت مٹائی جاتی ہے

مومن:

آج وہ غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہیں　　خود بخود منفعلِ جور ہیں شرماتے ہیں

حسرتؔ:

تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسنِ تازہ کاران کا　　　کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے

داغؔ:

دل لے کے وہ اب جان طلب کرتے ہیں ہم سے　　　یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی

حسرتؔ:

قُرب میں ہے نہ بُعدِ یار میں تھا　　　جو مزہ اس کے انتظار میں تھا

لاعلم:

نہ کبھی وصل یار میں دیکھا　　　جو مزہ انتظار میں دیکھا

حسرتؔ:

اپنی ہستی سے بھی آخر ہوگیا بیگانہ میں　　　ان سے جب جا کر ہوئی حاصل شناسائی مجھے

منسوب بہ سلطان ابو سعید ابوالخیر:

هر کس بتوره یافت زخود گم گردید　　　آنکس که ترا شناخت خود را نشناخت

حسرتؔ:

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے　　　بانٹے ہیں بہار نے خزانے

آتشؔ:

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف　　　قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

حسرتؔ:

پھرتی رہتی ہے آدمی کو لیے　　　خوار دنیا میں آدمی کی ہوس

خواجہ میر دردؔ

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یاں

اپنے اپنے بورئے پر جو گدا تھا شیر تھا

حسرتؔ:

ناواقفِ بے ثباتی گل بلبل ہیں کہ محو رنگ و بو ہیں

لاعلم:

غنچہ و گل میں دھرا کیا ہے بتا اے بلبل جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

حسرتؔ:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین یا عکس مے شیشہ گلابی

حافظ:

تنت در جامہ چون در جام بادہ دلت در سینہ چون در سیم آھن

حسرتؔ:

کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرتؔ سا غیور

اور اسے آپ نے خود کردۂ دشنام کیا

نواب یوسف علی خاں ناظم:

الفت میں کیا بلا ہے کہ ناظم سا آدمی منت کش عدوٗ سر بازار ہوگیا

اس میں داغؔ کا یہ مصرعہ بھی شامل کرلیجیے ''معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی'' تو ماخذ کی حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

حسرتؔ:

غم سے نہیں اک دل بھی آزاد فریاد زدستِ عشق فریاد

منسوب بہ سلطان ابوسعید ابوالخیر:

وافریاد از عشق وافریادا

حسرتؔ:

دیکھئے کوئی نیرنگ محبت کے کرشمے کرتے ہیں جفا آپ تو دیتا ہوں دعا میں

حافظؔ:

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

حسرتؔ:

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ندیم [مرزا علی بیگ]

از تو دل مہر و وفا می خواہد   سادگی بین کہ چہا می خواہد

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا   جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

سرقاتِ اصغر گونڈوی:

اصغرؔ:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا   جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

ملکِ قمی:

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام   در گریبانِ خودم بود چو بیدار شدم

ترجمہ: میں نے خواب میں دیکھا کہ تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خود اپنا گریبان پکڑے ہوئے ہوں۔

اصغرؔ:

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں   آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

ملک قمی:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ را ہم دور شد

اصغرؔ:

ہے تلوں سے ترے جلوۂ نیرنگِ حیات   میں تو مر جاؤں جو امید وفا ہو جائے

اب تو غالبؔ کا یہ مشہور شعر آپ کو خود ہی یاد آ گیا ہوگا یعنی:

ترے وعدہ پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اصغرؔ:

اک شور اٹھا لیلیٰ خلقت نے سنا لیکن　　پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

غالبؔ:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بتنگیٔ چشمِ حسود تھا

اصغرؔ:

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں　　خون میں گرمیٔ ہنگامۂ منصور ہے آج

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

اصغرؔ:

ماورائے سخن بھی ہے اک بات　　بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

فارسی اور اردو کے یہ دو مشہور مصرعے یاد کیجیے:

خموشی معنی ای دارد کہ در گفتن نمی آید

خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

اصغرؔ:

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے　　جمالِ دوست و شب ماہ و بادۂ گلگوں

خیامؔ:

ساقی عیش سر برافروختہ است　　می دہ کہ فلک نکتہ ای آموختہ است

دانی کہ اجل چو برق خرمن سوز است　　تا در نگری خرمنِ ما سوختہ است

می نوش بنورِ ماہ ای ماہ کہ ماہ　　بسیار بتابد و نیابد ما را

مہتاب بنورِ دامن شب بشگافت　　می خور کہ دمی خوشتر ازین نتوان یافت

اصغرؔ:

پھر یہ سب شورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے　　اسی پردہ میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

غالبؔ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سرقاتِ فانی:

فانیؔ:

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا　　جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

غالبؔ:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

فانیؔ:

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت　　احباب سے غمخوار ہوا بھی نہیں جاتا

غالبؔ:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

فانیؔ:

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن　　ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر

غالبؔ:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

فانیؔ:

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی　　یقین وعدۂ پیغام بر نہیں ہے مجھے

غالبؔ:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

فانیؔ:

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود　　شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

غالبؔ:

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالبؔ　　کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

جگرؔ:

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار　　خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے

غالبؔ:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے　　کوئی بتلاؤ ہم بتلائیں کیا

جگرؔ:

تصویرِ امیدوں کی آئینہ ملا لوں گا　　انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا

غالبؔ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جگرؔ:

سر رکھ ہی دیا سنگِ دریار پہ میں نے　　اب حشر بھی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو

غالبؔ:

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ　　اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

جگرؔ:

میں وہاں ہوں نہیں جہاں میں بھی　　عالم و ماورائے عالم کیا

غالبؔ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

پینتیس XXXV

جگر:

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے — کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

غالب: — نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

جگر:

صبح تک یہ یادگارِ عشق بھی افسانہ تھی — شمع اب ہے دفن جس جا تربت پروانہ تھی

سرورؔ جہاں آبادی:

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا — یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

جگر:

لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو — چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

داغؔ:

عشق منہ پر مرے لکھا ہو تو کیا اس کا علاج — جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے

جگر:

محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی — کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

عالیجاہ قضاؔ لکھنوی:

محشر میں مسکرا کے گلے سے لگا لیا — کشتوں سے اپنے چال قیامت کی چل گئے

جگر:

بعد مرنے کے بھی قرار نہیں — مرگِ ناکام اس کو کہتے ہیں

ذوقؔ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جگر:

وہ ہنس رہے ہیں مرے حال پر ہنسا کرتے — یہ بہہ رہے ہیں جو آنسو یونہی بہا کرتے

میرؔ:

مجھ کو روتا دیکھ اس نے ہنس دیا   برق چمکی ابر باراں تھم رہا
[۳۵]

اکابرین کے سرقے فارسی سے:

۱۔وقوعیؔ تبریزی:

مے نماید کہ سر عہد شکستن داری

خشم این بار تو چون رنجش ہر بار تو نیست

ترجمہ:ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم وعدہ شکنی کا ارادہ رکھتے ہو کیوں کہ اس مرتبہ تمہاری خفگی ہمیشہ جیسی نہیں ہے۔

غالبؔ:

بار ہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
لیکن اب کے سر گرانی اور ہے

۲۔مرزا مظہرؔ جان جاناں:

حیف دردی کہ بہ خود ننگ مداوا برداشت

بہر جانی نتوان ناز مسیحا برداشت

ترجمہ:وائے ہوا اس درد پر جس نے علاج کی شرمندگی سہی۔ایک جان کے لیے مسیحا کا احسان نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مومنؔ:

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے؟

۳۔ظفر خان، احسن:

این سخن از پیر کنعانم به خاطر مانده است

دیدن روی عزیزان چشم روشن می کند

ترجمہ: پیر کنعاں کی یہ بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں ۔

شہیدی:

سپیدی چشم کی زائل ہو دیدار عزیزاں سے

اڑایا ہم نے یہ نسخہ بیاض پیر کنعاں سے

۴۔عرفی:

چشمم نه بهر خویش دم نزع تر شود

ترسم که من بمیرم و غم در بدر شود

ترجمہ: مرتے وقت میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ اس ڈر سے روتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد غم دردر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔

غالب:

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

۵۔ملک قمی:

ز شوق سیر گلزار آن قدر فرصت نمی یابم

که در پای گلی بنشینم و خاری برون آرم

ترجمہ: سیر گلزار کا شوق اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کسی پھول کے نیچے بیٹھ کر کانٹا نکالوں ۔

مظفر خاں گرم:

فرصت کہاں ہے اتنی جنوں میں کہ بیٹھ کر
تلووں سے اپنے خار مغیلاں نکالیے

۲۔نعمت خاں عالی:

نخواهد گفت ترک بت پرستی های دل زارم
کہ چون سنگ سلیمانی است زنّاری که من دارم

ترجمہ: میرا دل زار کسی حال میں بت پرستی چھوڑنے والا نہیں۔میرا زنا رسنگ سلیمانی کی لکیروں کی طرح ہے۔کہ جب تک وہ پتھر باقی ہے لکیریں بھی باقی ہیں۔

سودا:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زُنار تسبیح سلیمانی

۷۔کمال اسماعیل اصفہانی:

ز خضر عمر فزون است عشق بازان را
اگر ز عمر شمارند روز هجران را

ترجمہ: اگر روز ہجر کو بھی عمر میں شمار کر لیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے۔

غالب:

بتلاؤں کیا، ہوں کب سے جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

۸۔آنند رام مخلص:

ازان هر لحظه در بر می کشم سرو گلستان را
کہ این رعنا جوان بسیار می ماند به یار من

ترجمہ: ہر لحظہ میں سروِ چمن کو اس لیے آغوش میں لیتا ہوں کہ وہ میرے محبوب سے بہت ملتا جلتا ہے۔

ذوق:

تیرے تصورِ قدِ رعنا میں آج ہم!
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

۹۔میر والہی قمی:

آمدی بر سر خاک من و شرمنده شدم
کین زمان از پی قربان تو جان می بایست

ترجمہ: تم میری قبر پر آئے اور میں شرمندہ ہو گیا کیوں کہ اس وقت مجھے تم پر سے جان نچھاور کرنی چاہیے تھی اور جان میرے پاس موجود نہیں۔

میر تقی میر:

ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اس نے کیا
رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں

۱۰۔جلال یزدی:

از شوق تو صد بوسه زنم بر دهن خویش
هر گاه که نام تو بر آید ز زبانم

ترجمہ: جس وقت تیرا نام میری زباں سے نکلتا ہے تو میں تیرے شوق میں سینکڑوں مرتبہ اپنا منہ آپ چومتا ہوں۔

غالب:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مرے زبان کے لیے

طالب آملی:

چو نام او برم از ذوق ملتی کارم
بجز لب و دهن خویشتن مکیدن نیست

ترجمہ: جب میں اس کا نام لیتا ہوں تو ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ مدت تک اپنے لب ودہن کو چوستا رہتا ہوں۔

حزیں:

تا نام شب وصل تو آمد به زبانم
چون شمع لبم می مکد از ذوق دهن را

ترجمہ: جب سے تیری شب وصال کا نام میری زبان پر آیا ہے تب سے شمع کی مانند میرے لب میرے دہن کو چوستے ہیں۔

لا اعلم:

زین نام چو تر کنم زبان را
جان بوسه دهد سر زبان را

ترجمہ: جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح میری زبان کو چوم لیتی ہے۔

۱۱۔حزیں:

قیامت است دران دم که بهر زنده شدن
اگر زکوی تو خاک مرا جدا سازند

ترجمہ: جس وقت میری خاک زندہ ہونے کے لیے تیرے کوچے سے جدا کی جائے گی وہی ساعت قیامت ہوگی۔ ''اگر زائد، بلکہ مخل ہے۔

سودا:

قیامت آئے گی اس دم کہ بہر جینے کے
تری گلی سے مری لاش کو اٹھائیں گے

۱۲۔میر مومن:

بہ گوش پنبہ نہم از صدای خندۂ گل
دماغ نالۂ بلبل درین بہار کجاست

ترجمہ: اس بہار میں نالۂ بلبل کے سننے کا دماغ کسے یہاں تو خندۂ گل کی صدا بھی ناگوار ہے۔چناں چہ میں تو کان میں روئی رکھ لیتا ہوں۔

لاعلم:

مارا دماغ گلشن و باغی نماندہ است
ای بوی گل برو کہ دماغی نماندہ است

ترجمہ: ہمیں سیر چمن کی برداشت نہیں۔اے بوئے گل! چلی جا کہ یہاں دماغ ہی نہیں رہا۔

غالب:

فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

۱۳۔صبوحی چغتائی:

کبوتر نامہ ام برد و نہ شد معلوم حال او
مگر در رہ ز سوز نامۂ من سوخت بال او

ترجمہ: کبوتر میرا خط لے گیا اور پھر اس کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔شاید میرے خط کے سوز سے راستے میں اس کے پر جل گئے۔

تعشق لکھنوی:

لکھا تھا خط میں انھیں حال آہ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

۱۴۔حامدی قمی:

ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیال تو
چسان بینم که افتد چشم غیری بر جمال تو

ترجمہ:اگر دل میں تیرا خیال گزرے تو مجھے اپنے دل پر بھی رشک آنے لگتا ہے۔ پھر بھلا میں اس بات کو کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں کہ غیر تجھے دیکھے۔

غالب:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۱۵۔قاسم کاہی:

بروز هجر مرا دیده بس گهر بار است
شبی که ماه نباشد ستاره بسیار است

ترجمہ:ہجر کے دن میری آنکھوں سے موتی برس رہے ہیں۔جس رات چاند نہیں نکلتا ستارے بکثرت ہوتے ہیں۔

سراج دکنی:

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

۱۶۔لاأعلم:

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبای کیست که وا می کنیم ما

ترجمہ: پھول کی پنکھڑی کی طرح ناخن معطر ہوگیا۔ یہ میں کس کا بند قبا کھول رہا ہوں۔

انعام اللہ خاں یقین:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا

۱۷۔ جامی:

آسمان جام نگون دان کز می عشرت تهی است
جستن می از تهی ساغر نشان ابلهی است

ترجمہ: آسماں کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شراب عیش سے خالی ہے۔ خالی جام سے شراب چاہنا حماقت کی نشانی ہے۔ اسی مضمون کو ہمارے تین مسلم الثبوت استادوں نے باندھا ہے اور تینوں کا اپنا اپنا مخصوص رنگ نمایاں ہے:

سودا:

نہیں ہوں طالب رزق آسماں سے کہ مجھے
یقین ہے کاسۂ واژوں میں کچھ نہیں ہوتا

ذوق:

مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

غالبؔ

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

۱۸۔ فرقتی جوشقانی:

چه شد اگر مژه بر هم نمی توانم زد
که لب به لب نرسیده است هیچ دریا را

چوالیس XLIV

[اگر میری پلک سے پلک نہیں لگتی تو کیا ہوا، کسی دریا کے کنارے آپس میں کبھی نہیں ملے]

کرم اللہ خاں درد:

کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو
پلک لگنے کی لذت دیدۂ پر آب کیا جانے

۱۹۔ لاأعلم:

زغارت چمنت بر بہار منت ھاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

ترجمہ: چمن کو لوٹ کے تو نے بہار پر احسان کیا ہے کیوں کہ پھول تیرے ہاتھ میں شاخ سے کہیں زیادہ تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔

ابوالقاسم، مرزا تخلص، ندیم ابوالحسن تانا شاہ، بادشاہ دکن:

مرزا وہ نونہال چمن مٹ گئے کدھر
لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

۲۰۔ ظہوری:

گرچہ خردیم نسبتی است بزرگ
ذرۂ آفتـــاب تـــابـــانیـــم!

ترجمہ: اگر چہ ہم چھوٹے ہیں مگر نسبت بڑی ہے۔ ہم آفتاب تاباں کا ذرہ ہیں۔

حسرت موہانی:

پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں
تیری نسبت سے آفتاب ہوا

۲۱۔ ملک قمی:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نھان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راھم دور شد

اصغر گونڈوی:

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

۲۶۔غنیمت:

بگفتا قیمتش؟ گفتم نگاہی
بگفتا کمترک؟ گفتم کہ گاہی

اس نے کہا۔اس کی قیمت؟ میں نے کہا ایک نگاہ،اس نے کہا کچھ کم؟ میں نے کہا [وہی نگاہ] کبھی کبھی [سہی]۔لطیفہ اس میں یہ ہے کہ ''نگاہ'' پہلے قیمت بتائی تھی۔خریدار نے کہا کچھ کم کرو، بیچنے والے نے ''نگاہ'' میں سے ''نون'' کم کر دیا،صرف ''گاہ'' رہ گیا۔

جگر مرادآبادی:

ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غم جاناں دل کی قیمت کیا کہیے

۲۷۔مرزا علی بیگ ندیم:

از تو دل مہر و وفا می خواہد
سادگی بین کہ چہا می خواہد

ترجمہ: دل تجھ سے مہر و وفا چاہتا ہے۔ذرا اس کی سادگی تو دیکھ کہ کس چیز کا طالب ہے۔

حسرت موہانی:

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

حسرت کا شعر ندیم کے شعر کا ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

۲۴۔ملک قمی:

خواب دیدم که ترا دست بدامن زده ام

در گریبان خودم بود چو بیدار شدم

ترجمہ: میں نے خواب میں دیکھا تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب میں جاگا تو دیکھا کہ اپنا ہی گریبان پکڑے ہوئے ہوں۔

اصغر گونڈوی:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

۲۵۔لاعلم:

خوبرویان کشادہ رو باشند

تو کہ روبستہ ای مگر زشتی؟

ترجمہ: حسین تو بے پردہ رہتے ہیں، تم نے جو اپنا منہ ڈھانکا ہے تو کیا تم بدصورت ہو۔

جگر مرادآبادی:

موسیٰ کی طرح کون سنے لن ترانیاں

بے عیب ہے جو حسن تو پردہ نہ کیجیے

۲۶۔لاعلم:

شرمنده ام کردی مگو عذر جفا زین بیشتر

من از تو این مقدار هم آزرده خاطر نیستم

ترجمہ: تم نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔بس اب اور زیادہ عذر جفا نہ کرو۔میں تم سے اس درجہ آزردہ بھی نہیں ہوں۔

حسرت موہانی:

عذر ستم غرور نہ تھا آپ کے لیے
حسرت کو شرمسار ندامت نہ کیجیے

۲۷۔نظیری:

ز فرق تا بہ قدم ھر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ترجمہ: سر سے پاؤں تک جس جگہ نظر ڈالتا ہوں دل اسی کی طرف کھنچنے لگتا ہے کہ سب سے بہتر یہی ہے۔

جگر مرادآبادی:

کس ادا پر جان دوں، تو ہی بتا اے حسن یار
جس ادا کو دیکھتا ہوں حسن کی تصویر ہے

۲۸۔عرفی:

از در دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم
ھمہ شوق آمدہ بودم ھمہ حرمان رفتم

ترجمہ: کیا بتاؤں کہ در دوست سے میں کس حال میں واپس ہوا۔ سراپا شوق بن کر آیا تھا یکسر محرومی بن کر چلا۔

حسرت موہانی:

آئے تھے محفل میں تیری با ہزاراں آرزو
یا چلے ہیں ایک لے کر خاطر ناشاد ہم

۲۹۔بابا فغانی:

خوبی ھمین کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ھاست بتان را کہ نام نسیت

حسرت موہانی:

اہل نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز

حافظؔ کا یہ شعر بھی ساتھ ساتھ پڑھنا چاہیے۔

شاهد آن نیست که مویی و میانی دارد
بندهٔ طلعت آن باش که آنی دارد

۳۰۔حافظؔ:

تنت در جامه چون در جام باده
دلت در سینه چون در سیم آهن

ترجمہ: لباس کے اندر تیرا جسم ایسا ہے جیسے جام میں شراب اور سینے کے اندر تیرا دل ایسا ہے جیسے چاندی میں لوہا۔

حسرت موہانی:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکس مے سے شیشہ گلابی

۳۱۔حافظؔ:

هرگز نمیرد آن که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

ترجمہ: جس کا دل عشق سے زندہ ہوگیا وہ کبھی نہیں مرتا۔ہماری ابدیت تو دفتر عالم میں درج ہے۔

حسرت موہانی:

تجھ پہ مٹے تو زندۂ جاوید ہوگئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

۳۲۔خواجہ غلام غوث بےخبر:

بخت کجاست بی خبر تابه رکاب او دوم

بر سر ره نشسته ام، نیم نگاهم آرزوست

ترجمہ: اے بےخبر! ایسی قسمت کہاں کہ اس کے ہم رکاب دوڑوں۔ راستے کے کنارے بیٹھا ہوا ہوں۔ بس اتنی آرزو ہے کہ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لے۔

حسرتؔ موہانی:

بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی سر راہ

گزرے ادھر سے شاید وہ ذی جاہ

پیامیؔ:

بیم از وفا مدار بده وعده ای که من

از ذوق وعدهٔ تو به فردا نمی رسم

ترجمہ: تو مجھ سے وعدہ کر لے۔ اس کی فکر نہ کر کہ وعدہ پورا کرنا بھی پڑے گا کیوں کہ تیرے وعدے کی خوشی سے میں آج ہی شادی مرگ ہو جاؤں گا۔ کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا جو ایفائے وعدہ کی نوبت آئے۔

غالبؔ:

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لالہ خاتون:

من اگر توبه زمی کرده ام ای سرو سهی

تو خود این توبه فکر دی که مرا می ندهی

ترجمہ: اے سرو سہی، اگر میں نے مے خواری سے توبہ کی ہے تو تو نے تو مجھے شراب پلانے سے توبہ نہیں کی۔ پھر تو کیوں نہیں پلاتا۔

غالبؔ:

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

جلالؔ:

از شوق تو صد بوسہ زنم بر دھن خویش
ھر گاہ کہ نام تو بر آید ز زبانم

لااعلمؔ:

زین نام چو تر کنم زبان را
جان بوسہ دھد سر زبان را

ترجمہ: جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح زبان کو چوم لیتی ہے۔

غالبؔ:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

حامدیؔ:

ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیال تو
چسان بینم کہ افتد چشم غیری بر جمال تو

ترجمہ: اگر تیرا خیال میرے دل میں گزرے تو مجھے اپنے دل پر رشک آنے لگتا ہے۔ پھر بھلا میں کیوں کر دیکھ سکتا ہوں کہ کسی غیر کی تجھ پر نظر پڑے۔

غالبؔ:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خیامؔ:

گر میل تو با بی خرد و نااهل است

من نیز چنان اهل و خرد مند نیم

ترجمہ: اے آسماں اگر تو احمقوں اور نالائقوں کی طرف مائل ہے تو میں بھی تو کچھ ایسا دانش منداور لائق نہیں ہوں ۔

غالبؔ:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

کس لیے ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لاادریؔ:

زخضر عمر فزونست عشق بازان را

اگر زعمر شمارند روز هجران را

ترجمہ: اگر فراق کے دن بھی عمر میں شمار کیے جائیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے ۔

غالبؔ:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں

شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

جامیؔ:

آسمان جام نگون دان کز می عشرت تهی است

جستن می از تهی ساغر نشان ابلهی است

ترجمہ: آسمان کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شراب عیش سے خالی ہے ۔خالی جام سے شراب چاہنا بے وقوفی کی علامت ہے ۔

غالبؔ:

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

نظیریؔ:

راز دیرینہ ز رخ پردہ برانداخت دریغ
حال ما شهره به انشای غزل ساخت دریغ

ترجمہ: ھائے پرانا راز افشا ہوگیا۔غزل نگاری کی بدولت ھمارا حال سارے شہر میں مشہور ہوگیا۔

غالبؔ:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

معزفطرتؔ:

هر عضو من ز دست تو دارد شکایتی
چون ارغنون لبالبم از ناله های زار

ترجمہ:میرا ھر ھر عضو تم سے گلہ مند ہے۔ارگن کی طرح میں نالہ ھائے زار سے پر ہوں۔

غالبؔ:

پرہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

لاأعلم:

سرت گردم بزن تیغ و دری بر روی دل بکشا
دم تنگ است و کار از زخم پیکان بر نمی آید

ترجمہ: تیرے قربان، تلوار لگا اور دل کے سامنے ایک دروازہ کھول دے۔ میرا دل بہت تنگ ہے پیکان کے زخم سے کام نہیں چلے گا۔

غالبؔ:

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

صیدیؔ طرانی:

چہ بھرہ از گل رویش ھوس گداختہ را
بھار فیض نبخشد جنون ساختہ را

ترجمہ: ھوس کے مارے ہوئے کو اس کے گل عارض سے کیا ملے گا۔ مصنوعی دیوانگی کو بہار سے کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔

غالبؔ:

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

یاسمنؔ [تذکرہ شمیم سخن]

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالبؔ:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[۳۱]

غالب کے یہاں سرقہ کی امثال درج ذیل ہیں:

حیدرؔ تبریزی:

چو ریزم اشک از دل آہ درد آلود می خیزد
بلی چون آب بر آتش بریزد دود می خیزد

غالبؔ:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھی ہے صدا   ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ذوقیؔ سمرقندی:

مکن تغافل ازین بیشتر که می ترسم   گمان برند که این بنده بی خدا وندا ست

غالبؔ:

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزرے غالب   ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بیدلؔ:

میرو د از خویش و در اندیشۂ باز آمدن   همچو عمر رفته یارب بر نگردانی مرا

غالبؔ:

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

خواجہ دردؔ:

به هیچ کار کتب خوانیت نمی آید   ز جمع خاطرِ خود نسخه ای فراهم کن

غالبؔ:

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

فیاض لاہجی:

هر کس که زخم کاری ما را نظاره کرد   تا حشر دست و بازوی او را دعا کند

غالبؔ:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

راقمؔ مشہدی:

میکند وعدۂ دیدار به فردا، امروز   یار دانسته که امروزِ مرا فردا نیست

غالبؔ:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

زلالی خوارزمی:

تنها نصیبِ من غم و دردِ حبیب نیست — از هیچ درد و غم دلِ ما بی‌نصیب نیست

غالبؔ:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

شمس تبریزؔ:

در شرابم چیز دیگر ریختی — باده تنها نیست، این آمیختی

غالبؔ:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

طالب آملی:

ای گوش رغبتم احول شدی چو چشم — تا هر چه گفتی از تو مکرر شنیدمی

غالبؔ:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

فریدونؔ خراسانی:

از ضعفِ دل منال فریدون ز بیکسی — میدار دل قوی که کسِ بیکسان خداست

غالبؔ:

بے دل نہ ہو بیگانگی خلق سے غالبؔ — کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

کلیم کاشمیری:

ز خضر عمر فزون است عشق بازان را — اگر ز عمر شمارند روز هجران را

غالبؔ:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

رضی سمرقندی:

ستاره ایست دُرِ گوش آن هلال ابرو زروی حسن به خورشید میزند پهلو

غالبؔ:

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا اوج پرستارۂ گوہر فروش ہے

آرزو [سراج علی خاں] کے ایک شاگرد نجات کا شعر ہے:

بـا آنکـه همـه عـمر نرفتم زدرِ او پرسند زمن از ناز ترا خانه کدام است

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے گھر بار کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اسی کے در پر پڑا رہتا ہوں مگر از راہ ناز مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ "آپ کا دولت خانہ؟"

غالبؔ:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

آصفی شیرازی:

تو هم در آئینه حیران ز حسنِ خویشتنی زمانه ایست که هر کس به خود گرفتار است

غالبؔ:

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے میرا زانو مونس، آئینہ تیرا آشنا

آذری طوسی اسفرائنی:

جـانـی کـه داشـت کو فدای تو آذری شرمنده از تو گشت که جانِ دگر نداشت

غالبؔ:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالبؔ:

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو　　ہمیں دماغ کہاں خندہائے بے جا کا

ابوتراب:

نکہت گل رساند پیغامی　　بی دماغی نداد هیچ جواب

یا خضریؔ لاری کا یہ مصرع　　دربزم او کسی به بدی هم نه برد نام

اور غالب کا یہ مصرع　　ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

یا شیدائی دیوانہؔ کا یہ مصرع　　باخضر کس نگفت که عمرت دراز باد

اور غالب کا یہ مصرع　　دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز[۴۷]

فارسی محاروں کے سرقے:

حسرت نے ''نکات سخن'' کے باب ''محاسن سخن'' میں اساتذہ کے مصرع اور شعر ''ترجمہ محاورہ فارسی'' کے ذیل میں نقل کیے ہیں۔ یہ اشعار اور مصرعے اردو شعراء، آبروؔ، شاہ حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، جعفر حسرتؔ، میر حسنؔ، راسخ عظیم آبادی، قائم چاند پوریؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، سعادت ناصرؔ، ہوسؔ، تنہاؔ، شاہ نصیرؔ، عیشیؔ، میر ممنونؔ، زکی مراد آبادیؔ، صابرؔ دہلوی، غالبؔ، شیفتہؔ، رشک لکھنویؔ، قلقؔ، میر تقی میرؔ، بحرؔ لکھنوی، اسماعیل میرٹھی، حسرتؔ موہانی شامل ہیں۔ فارسی محاوروں کا کثرت سے ترجمہ میر تقی میرؔ نے کیا ہے۔ متقدمین نے فارسی محاورے ترجمہ کر کے سرقہ کر لیے ہیں لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا اور اب اسے سرقہ نہیں سمجھا جاتا۔[۴۸]

حسرت نے ترجمہ محاورہ فارسی کی جو مثالیں دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین اور متوسطین کے یہاں کثرت سے شعر کے بعض اجزاء یا پورا مصرعہ ترجمہ کر لیا گیا ہے حسرتؔ موہانی نے ان سرقوں کو اپنی کتاب نکات سخن کے باب ''محاسن سخن'' میں شامل کیا ہے۔ لیکن اسے لائق مذمت قرار دینے کے بجائے اسے محاسن سخن قرار دیا ہے۔ حسرت اگر یہ مثالیں اگر ''معائب سخن'' کے باب میں شامل کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔

فارسی شعراء کے اشعار سے مضامین لے کر انھیں اردو میں ترجمہ کرنا متقدمین کا دل پسند مشغلہ تھا۔اس مشغلے کی کچھ جھلکیاں علامہ منیر لکھنوئ نے "منیر البیان فی تحقیق اللسان" میں جمع کر دی ہیں۔ان امثال کو توافق، توارد، استفادہ، اخذ، ترجمہ، استفاضہ، افادہ اثر متوازیات نہیں کہا جا سکتا۔یہ سراسر سرقہ ہے۔ان اشعار کی تعداد ۱۹۱ ہے۔یہ اشعار ضمیمہ میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔منیر لکھنوئ نے میر، جلیل بلگرامی، ذوق، معروف، ناسخ، سودا، فغان کے اشعار نقل کیے ہیں جو اشرفؔ، ناصرؔعلی، بیدلؔ، جلالؔ، خسرؔو، سعدؔی، سلیمؔ، غنؔی، قدسؔی وغیرہ کا چربہ ہیں۔[۳۹]

سرقوں کی صدی انیسویں صدی:

شاعری میں سرقوں کا راز انیسویں صدی کے شروع میں بے نقاب ہو گیا تھا اور مختلف رسائل و جرائد میں کثرت سے مضامین اور امثال کی اشاعت کے ذریعے شعراء کی سرقہ بازی کو افشاء کرنے کی روایت تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ان حوالوں کی تفصیلات دستیاب نہیں۔حکیم ابو العلاء ناطق لکھنوی کا مضمون جو ۱۹۳۰ء میں زمانہ کانپور میں شائع ہوا اس کے مطالعے سے اس دور میں سرقے سے متعلق غلغلے اور ہنگامے کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔اس مضمون میں ناطق لکھنوی نے سرقوں کے وقوع پذیر ہونے کی عجیب دلیل دی ہے۔ فرماتے ہیں:

سرقہ کیوں ہوتا ہے؟

"سرقہ یا اخذ یا نقل یا ترجمہ یا تقلید زیادہ تر ان اشعار میں ممکن و آسان ہے جن میں کوئی مضمون معمولی الفاظ میں نظم کر دیا گیا ہو، اور جس کی خوبی کسی ایسی لطافت پر مبنی نہ ہو جس کا ذکر مذکورہ بالا دس صورتوں میں کیا گیا ہے۔مضمون کے علاوہ انتقال کی دوسری صورت یہ ہے کہ مضمون سے مضمون پیدا کر لیا جائے۔اس کو اخذ کہتے ہیں۔تیسری صورت یہ ہے کہ صرف تخیل شعری منتقل کر لی جائے۔چوتھی صورت یہ ہے کہ اندازِ بیان لے لیا جائے،

پانچویں صورت یہ ہے کہ اسلوبِ نظم سے ایک خاص رخ جس شعر میں پیدا ہو کر شعر کو پُر کیف و پُر لطف بنا دے وہ رخ لے لیا جائے، چھٹی صورت یہ ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا جائے، ساتویں صورت یہ ہے کہ شعر کے اجزائے معنوی و لفظی میں سے کوئی جز و منتقل کر لیا جائے اور باقی اجزا خود اضافہ کر کے شعر مکمل کر لے کہ جس قسم کی تشبیہہ یا استعارے سے شعر میں محاکات یا ندرت پیدا کی جائے اس قسم کی چیز لے کر اسی طرح کی لطافت شعر میں پیدا کرے۔[۴۰]

یعنی سرقے کا اصل سبب سارق نہیں بلکہ وہ شاعر ہے جس نے اتنا کمزور، پھسپھسا، ہلکا کلام پیش کیا جس کے باعث اس کا سرقہ کر لیا گیا۔ اس کا کلام محاسن، شاعری کا جامع ہوتا تو چور کو چوری کی جرأت نہ ہوتی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناطق نے فقہ کے ان اصولوں کا یہاں انطباق کیا ہے جو سارق کی سزا سے متعلق ہیں۔ مثلاً اگر مالِ مسروقہ کھلا رکھا گیا تھا، اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور مالک نے اسے مناسب طریقے سے محفوظ نہیں کیا تو اس صورت میں چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ناطق نے اس کلام کی دس صفات بیان کی ہیں جو ہمیشہ سرقے سے محفوظ رہے گا اور مثال کے طور پر انھوں نے ''حافظ'' کا حوالہ دیا ہے کہ حافظ اور ان کے ہم رنگ شعراء کے کلام سے چوری بہت کم ہوئی ہے۔ کیوں کہ حافظ کے کلام کی چوری ممکن ہی نہیں۔[۴۱]

ناطق کی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعراء کو اعلیٰ درجے کی شاعری کرنی چاہیے تاکہ سرقے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو ورنہ سارق کو سرقے سے روکنا ناممکن ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

شاعری کا سرقہ روکنے کی دس ترکیبیں:

عموماً نثر میں اور خصوصاً نظم میں چند صورتیں ایسی ہیں کہ سرقہ و ترجمہ ناممکن ہے۔ مثال میں صرف فارسی و اردو کے شعر پیش کرتا ہوں، اسی پر دوسری زبانوں کا بھی قیاس کر لینا چاہیے۔

[ا] حروف والفاظ کی آواز تلفظ سے اگر کوئی کیفیت یا محاکات پیدا ہوتو اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا اور اگر ہوتو بے کار رہے ۔مثلاً فردوسی کا یہ شعر:

زنـــقـــارہ آواز آمـــد بـــرون کہ گردون دون است دون است ودون

اس شعر کا مقصود اصلی یہ ہے کہ نقارے کی آواز منقوش کی جائے اور مفہوم شعر یہ ہے کہ نقارے کو آسمان سے تشبیہ دے کر آسمان کو ہیچ وناچیز بتایا جائے ۔گو کہ تشبیہ کے لیے علامہ دوانی اور محقق طوسی نے یہ شرط لگائی ہے کہ مشبہ سے مشبہ بہ کو افضل ہونا چاہیے اور درحقیقت نقارے سے آسمان کا افضل واعلیٰ ہونا ظاہر واظہر من الشمس ہے ۔مگر فردوسی کے خدائے سخن ہونے کے یہی اسباب ہوئے کہ ترکیب تشبیہ کو پنہاں کر کے نقارے کو گردوں سے بہتر دکھانا اور نقارے کی آواز پیدا کرنا ہے ۔اب اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ کرے خواہ کوئی زبان کیوں نہ ہوتو نہ یہ تخیل آسکتی ہے نہ یہ محاکات ہوسکتی ہے یا یہ کہ امیر خسرو کا مقصد تھا کہ ایک صاحب [جوان کے مرشد کے پاس بیٹھے ہوئے گویا مکان کا قبالہ لکھوانا چاہتے تھے اور کھانا کھا لینے کے بعد بھی جمے رہے] اٹھ جائیں اور سمجھ جائیں کہ ان سے تشریف لے جانے کی درخواست کی گئی ہے ۔حضرت نظام الدین کے اس سوال کے جواب میں کہ نوبت جو آدھی رات کی نوبت تھی ''کیا کہتی ہے'' امیر خسرو نے فی البدیہہ اپنے اس مقصد کی تصویر اور اس کی محاکات ان الفاظ میں دکھائی:

''نان کہ خوردی خانہ برو، نان کہ خوردی خانہ برو، خانہ برو، خانہ برو نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو، خانہ برو خانہ برو.''

اب اگر اس کا ترجمہ کیا جائے گا تو یہ آواز پیدا نہیں ہوسکتی کیوں کہ ترجمہ میں یہ حروف کہاں، اور یہ وزن کہاں ۔

دوسری طرف ترجمہ نہ ہو سکنے کی یہ ہے کہ شعر کی تخیل یا محاکات کا دار و مدار محاورات پر ہو اور محاورے کا ترجمہ اول تو محاورے میں ہو نہیں سکتا، دوسرے یہ کہ اگر ہو بھی تو

محلِ استعمال میں فرق ہو جاتا ہے ۔مثلاً پہلو زدن" فارسی میں محاورتاً ایسے موقع پر کہا جاتا ہے جب کسی چیز کو کسی چیز کے برابر لا کے اسے اس سے بڑھا دینا مقصد ہوتا ہے ۔اس محاورے کو رضی سمرقندی ایسے موقع پر صرف کرتا ہے کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا ۔

ستاره ایست دُر گوش آن هلال ابرو　　　زروی حسن به خورشید می زند پهلو

میرا خیال یہ ہے کہ "میزند پہلو" کا ترجمہ اردو نثر میں بھی نہیں ممکن، بھلا شعر میں ترجمہ کہاں ہوسکتا ہے ۔ بلکہ صائب ایسا قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد وہ بھی اس محاورے کو اس طرح نہ کہہ سکا ۔

زند پهلو به گردون کوه عصیانی که من دارم　　　به صد دریانه گردد پاک دامانی که من دارم

یا خواجہ درد کے اس شعر میں محاورات ہی نے خوبیاں پیدا کی ہیں جو کہ ترجمہ میں ادا نہیں ہوسکتیں ۔

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تیسری صورت یہ ہے کہ صنعت ایہام جس شعر میں کسی لفظ دو معنی سے پیدا ہو جاتی ہے تو یہ مشکل ہے کہ اس کے ترجمہ میں بھی ایسا ہی ذو معنی لفظ مل جائے اور وہ صنعت اور وہی خوبی پیدا ہو جائے ۔صائب کہتا ہے:

اهل کمال رالبِ اظهار خامشی است

منت پذیر "ماهِ تمام" از هلال نیست

پہلے مصرع میں یہ مضمون بطور دعویٰ ہے کہ صاحبانِ کمال کو اپنے کمال کے اظہار میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی، ان کا خاموش رہنا خود اپنا اظہار ہے، دوسرے مصرع میں ثبوت مثالیہ پیش کرتا ہے کہ "ماہ ہلالی" جب تیس دن کا ہو کر مکمل ہو جاتا ہے تو پھر چاند دیکھنے یعنی ہلال کے نمودار ہونے کی احتیاج نہیں رہتی ۔اس شعر میں "ماہ تمام" کے دوسرے معنی "بدر" کے بھی ہیں اور خیال اسی طرف منتقل ہوتا ہے ۔اسی لیے اس میں ایہام ہے اور اسی میں لطف ہے ترجمہ کے بعد یہ

خوبی کہاں یاحضرت امیر مینائی نے اسی طرح ایک ذومعنی لفظ استعمال کیا ہے:

کیاغم ہے خزاں میں جونہیں طاقت پرواز　　　نکلیں گی جو''کلیاں''تو نکل آئیں گے پربھی

چوتھی صورت یہ ہے کہ صرف ایک ہی لفظ کی تکرار مصرع میں جو بظاہر مہمل ہو مگر استعمال کا خاص طریقہ مفہوم پیدا کردے جیسا کہ سوز کا یہ قطعہ ہے:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے　　　سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو　　　ارےرےرےرےرےرےرےرےرےرےرے

تیسرے مصرع کے آخر میں ''ریوڑ''اور پھر ''رے رے'' کا ریندھا دیکھنے میں تو نری ''ریں ریں'' ہے مگر ہر زبان میں ایسی آوازیں ہوتی ہیں جو معناً مہمل اور استعمالاً کسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ انہی سے محاکات ہوجاتی ہے۔آب حیات نے اس سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ غش آیا چاہتا ہے۔یہاں تک کہ غش آگیا مگر فی الحقیقت یہ منشا اس کا نہیں ہے بلکہ یہ اس کیفیت کا چٹخارا ہے جو کسی قلبی لذت کو آواز کے ذریعہ سے ظاہر کیا جائے۔غش کی محاکات ''ارے رے رے رے رے''یعنی پہلا لفظ ''ارے''پھر ''رے رے'' کی تکرار سے ہوتی ہے اور اس میں تین مرتبہ ''ارے رے'' مکرر ہے دونوں میں بہت نازک فرق ہے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ حروف روابط یا علامات تشبیہ وغیرہ کسی لفظ سے اس طرح مربوط وچسپاں ہوجائیں کہ ان کی تبدیلی سے محاکات برباد ہوجائے،ایسی حالت میں بھی ترجمہ بیکار و بے اثر ہوجاتا ہے،مثلاً لفظ ''چندانکہ''علامت تشبیہ ہے۔امید رازی نے اس کو ایک شعر میں ایسا چسپاں کیا ہے کہ اگر اردو میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو وہ کیفیت جو اصل شعر میں ہے پیدا نہیں ہوسکتی۔

کاش گردوں از سرم بیروں برد سودائے تو　　　یا مرا صبرے دھد چندانکہ استغنائے تو

چھٹی صورت یہ ہے کہ شعر یا مصرع مجموعی حیثیت سے اس قدر سلیس وصاف اور زبان وادب کی صفائی سے سہل ممتنع ہوجائے کہ اس کا کیف واثر اس کی مجموعی حالت سے

وابستہ ہو، ترجمہ میں اس کی تاثیر ہرگز نہیں آسکتی:

عرفیؔ:

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال　　　صد سال میتوان بہ تمنا گریستن

مومنؔ:

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا　　　نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

قدسیؔ مشہدی:

بیگانۂ آشنا نما تو　　　تو بیگانہ نمائی آشنا من

ذوقؔ:

تو جان ہے ہماری اور جان ہی ہے سب کچھ　　　ایمان کی کہیں گے ایمان ہی ہے سب کچھ

انوریؔ:

در آ در آ کہ ز تو کارمن بجان افتاد　　　عجب عجب کہ ترا یاد دوستان آمد

امیرؔ:

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ　　　ہمکو غصے پہ پیار آتا ہے

عبدالرحیم خان خاناں:

شمار شوق ندانستہ ام کہ تاچند است　　　جز این قدر کہ دلم سخت آرزو منداست

ساتویں صورت یہ ہے کہ نظم کا انتظام الفاظ مکرر کے الٹ پھیر سے ایسا کیا جائے کہ صرف تنظیم ہی شعر میں کیفیت شعری پیدا کردے۔ ترجمہ میں یہ اہتمام مشکل ہے۔

نواب عاقل خاں رازیؔ:

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود　　　ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

آٹھویں صورت یہ ہے کہ کوئی مثل مکمل نظم ہو جائے، ظاہر ہے کہ محاورہ و مثل کا ترجمہ دوسری زبان میں اور اسی خوبی سے مشکل ہے۔

ناطق مکرانی:

پیالہ در کلم و محتسب ز دیر گذشت   رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت

ذوقؔ:

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے   یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مصطفیٰ علی خاں خوشدل:

بوسم من بی برگ و نوا برگ حنارا   تابوسہ بہ پیغام دھم آن کفِ پارا

نویں صورت یہ ہے کہ کسی ترکیب سے بہت سا مضمون تھوڑے سے الفاظ میں آ جائے اور وہ ترکیب اس زبان کے لیے مخصوص ہو جیسا کہ فارسی میں اضافتیں اور مختلف ترکیبیں جتنے مضمون کو سمیٹ لیتی ہیں کسی اور زبان خصوصاً اردو میں غیر ممکن ہے اور فارسی شاعری کا جنگل مضامین کے لحاظ سے جتنا گنجان ہے دنیا کی ہر زبان اتنے کم الفاظ میں اتنا مضمون پیش نہیں کر سکتی۔عربی و سنسکرت میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ اکثر الفاظ اس قدر کثیر المعنی ہیں کہ ایک ایک لفظ کے بیسوں معانی ہیں اور ایک ایک مفہوم کے لیے صدہا الفاظ ہیں، مگر یہ صورت دوسری ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی کی چھ صورتیں اور توصیفی کی چند صورتیں اور اسم فاعل کا اختصار اور مختلف مرکب ٹکڑے [جیسے نو دولت، شیر دل وغیرہ] یہ سب مرکبات جو الفاظ کے لحاظ سے مختصر اور معانی کے اعتبار سے وسیع ہیں تمام زبانوں میں موجود نہیں ہیں۔تلمیحات البتہ اکثر زبانوں میں موجود ہیں مگر یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔بہر حال فارسی کے ایسے ایک شعر کا ترجمہ اردو وغیرہ کے ایک شعر میں نہیں ہو سکتا۔

غالبؔ:

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گہر بارش   شہید انتظار جلوۂ خویش است گفتارش

[ترجمہ] ہکلانے سے یاقوت [لب] جس سے موتی برستے ہیں اس [لعل لب]

کی نبض والی رگ تڑپتی ہے [یا پھڑکتی یعنی جنبش کرتی اور کانپتی ہے][گویا] اس کی گفتگو خود اپنے جلوے کے انتظار میں شہید ہے ۔ یہ صرت ترجمہ ہوا اس کے مناسبات اور لطائف لفظی و معنوی اس ترجمہ میں نہیں آئے ۔ یہ رنگ مرزا عبدالقادر بیدلؔ، جلال اسیرؔ، شوکتؔ بخاری، غنیؔ کشمیری اور چند شاعروں کے یہاں زیادہ ہے ۔

اس نویں صورت کے علاوہ باقی تمام صورتیں حافظؔ کے کلام میں بہ کثرت ہیں اسی وجہ سے ان کے اور ان کے ہمرنگ شعراء کے یہاں سے چوری بہت کم ہوئی ہے ۔

دسویں صورت یہ ہے کہ شعر میں کسی خاص ملک کا ذوق ہو اور دوسرے ملک میں وہ مذاق قابل تعریف نہیں ہے تو اس مضمون کے منتقل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی ۔ مثلاً فارسی کے اکثر اشعار میں ''من آں مرغم'' دیکھا گیا ہے، اردو میں اپنے آپ کو طائر تو کہہ سکتا ہے مگر مرغ یا مرغا نہیں کہہ سکتا ۔ یا ملا روز بہ شیرازی کا یہ شعر:

بہ ملک حسن بہ خوبی سر آمد است آں زلف   کہ در نسبت بہ دو جانب ز آفتاب رسد[۴۲]

اردو نثر میں سرقے کی روایت:

اردو شاعری میں سرقے کی رسم ابتداء سے عام تھی لیکن اردو نثر میں سرقہ کب سے شروع ہوا تاریخ اس باب میں خاموش ہے ۔ دستیاب معلومات کے مطابق سرقے پر سب سے شدید ردعمل کا اظہار لکھنؤ کے ''الناظر'' کے شمارے مئی ۱۹۱۹ء میں کیا گیا ۔

سرقوں کی روکنے کی تحریک:

ہندوستان کے شعراء و ادباء میں ادبی سرقوں کی وباء کو روکنے کے لیے رسالہ الناظر لکھنؤ نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مجلس احتساب'' قائم کی ۔ اس مجلس کی پہلی اور غالباً آخری طویل دستاویز الناظر میں ''سرقہ کا دور مجیرہ'' کے نام سے شائع ہوئی ۔ دستاویز کا مرکزی خیال یہ تھا کہ '' کانفرنس کے سامنے ایک لمبی فہرست ایسے جرائم [سرقوں] کی موجود ہے ۔[۴۳]

سرقے کے خلاف ''الناظر'' کی دستاویز:

الناظر میں شائع شدہ دستاویز سرقہ کا دو ر محرہ کا متن درج ذیل ہے:

''سرقہ کی رسم قبیح عہد عتیق کی یادگار ہے۔ اس رسم کی قباحت مسلم ہے، ہر قوم، ہر ملک، ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کو مذموم و قبیح سمجھتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ خداوند قدوس نے بھی اس کے سدباب کو ضروری سمجھا۔ چناں چہ منجملہ اور ذمائم و جرائم کی سزا و حدود مقرر فرمانے کے ساتھ سرقہ کی بھی ایک حد یعنی سزا مقرر فرمائی۔ چناں چہ قانون الٰہی کے اصل الفاظ یہ ہیں السّارق و السّارقۃ فاقطعوا ایدھما یعنی عورت و مرد جو بھی سرقہ کرے اس کے ہاتھ قطع کر دو، لیکن اس دنیا میں جو بدی و برائی کا بیج ایک مرتبہ بو دیا جاتا ہے پھر ہزار سعی کیجیے کہ وہ نہ اگے اور بالکل تباہ و برباد ہو جائے بالکل بے سود ہے اور یقیناً اس میں برگ و بار آئیں گے۔ چناں چہ بدی کی یہ رسم بھی باوجود تدابیر ممکنہ نہ رک سکی اور نہ مٹ سکی بلکہ زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ یہ بھی تدریجی ترقی کرتی رہی۔ اس رسم مذموم کا سب سے پہلا قدم جو بڑھا وہ شعراء کی طرف سے تھا۔

فارسی کا پہلا سارق امیر مقری ملک الشعراء تھا:

یہ تو معلوم نہیں کہ اس گروہ میں سب سے پہلے اس رسم کی کس نے پذیرائی کی۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایران کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور ایران میں جس نے سب سے پہلے سرقہ کیا وہ شاید امیر مقری تھا جو سلطان سنجر کا ملک الشعراء تھا جس نے سیف الدولہ کے خیالات متعلق بہ قوس قزح کو بالکل اپنا بنا کر پیش کیا۔ پھر تو رفتہ رفتہ اس طبقے میں یہ رسم عام ہو گئی چوں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیر اثر عالم وجود میں آئی اس لیے جب یہاں شعراء حشرت الارض کی طرح پیدا ہو گئے تو یہاں بھی یہ رسم وبا کی طرح عام ہو گئی۔ چناں چہ آپ ایسے شعراء کا کلام اٹھا کر دیکھیں سرقہ سے مملو ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے نے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ لیکن پہلے سرقہ کا یہ طریقہ تھا کہ غیر معروف اور

گزشتہ لوگوں کے خیال کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے تھے۔ ایک عرصے تک یہی دستور رہا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ معاصرین کے خیالات ونتائج افکار کو حک واضافہ کے بعد اپنا بنا کر پیش کیا جانے لگا چناں چہ میر انیس مرحوم کو کہنا پڑا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لیکن یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ اس کا اثر صرف نظم کے اندر محدود رہتا تھا، ستم تو یہ ہوا کہ نثر بھی نہ بچی اور اس پر بھی بغیر کسی زحمت کے قبضہ ہو گیا۔

ہندوستانی صحافت سرقے کی صحافت ہے:

ہندوستان کی صحافت کی جب کبھی تاریخ مدون کی جائے گی تو سرقہ کا ایک مستقل باب قائم کرنا پڑے گا کیوں کہ یہاں کی صحافت کی ترقی کا دارومدار اسی ایک صنعت پر رہ گیا ہے۔ جرائد واخبارات کی کثرت کے ساتھ مضمون نگار کی بھی کثرت ہو گئی ہے۔ جس شخص کو کاغذ پر دو چار الٹی سیدھی لکیریں کھینچنی آ گئیں انشا پرداز ہو گیا۔ حالاں کہ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولانا صاحب کا اس میں ایک حرف نہیں ہے، کسی دوسرے کا مضمون سامنے رکھا اور اس کی صورت مسخ کر کے ایک مضمون تیار کر لیا۔

قاعدہ ہے کہ ہر شخص کا ایک مخصوص رنگ انشاء ہوتا ہے۔ یعنی تحریر کی روش ہر شخص کی جدا ہوتی ہے اور ایک خاص اسٹائل ہوتا ہے جس میں وہ ہر قسم کے مضامین لکھتا ہے، مگر گروہ سارقین میں یہ بات نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ذات خاص کا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جس کے مضمون سے سرقہ کیا اسی کا رنگ آ گیا۔ ایسی صورت میں کوئی خاص رنگ کیوں کر قائم ہو سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ہندوستان کے ایک مشہور رسالہ کو ایڈٹ کرتا تھا۔ اس قسم کے اہل قلم کا مجھ کو اس وقت خوب تجربہ ہوا ہے۔ کوئی صاحب مضمون کے ساتھ منت وسماجت کا خط لکھتے ہیں۔ بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے۔

............غرض یہ کہ اس قسم کے مضامین نگار آج کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں، ان کا

استقراء نامہ محال ہو گیا ہے اور مجھے کہنے میں کوئی حجاب نہیں کہ اس خرابی کے باعث خود ایڈیٹر صاحبان ہیں۔

سارقوں کی فہرست طویل:

مجھے نہیں معلوم کہ میری طرح اور لوگ بھی ملک کی اس نئی ترقی سے واقف ہیں یا نہیں مگر میں ایک عرصہ سے واقف تھا چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت میرے سامنے ایک طویل فہرست ایسے فاضل مضمون نگاروں کی موجود ہے جن کی کارگاہ شہرت کا دارو مدار سرقہ کی رسم قدیم پر ہے۔ اس معاملہ میں جب میری معلومات اس قدر وسیع ہو گئیں تو میں نے خیال کیا کہ بعض دیگر بہی خواہان ملک وقوم کو اس سے آگاہ کروں۔ اتفاق سے جن جن بزرگوں سے میں نے ذکر کیا وہ بھی اس سے واقف نکلے۔

چناں چہ اس اہم معاملے کی نسبت دیر تک گفتگو رہی اور یہ طے پایا کہ ایک آل انڈیا احتساب کانفرنس قائم کی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ پہلے خفیہ طریقے سے ان حضرات کو متنبہ کیا جائے۔ اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے تو اس گروہ میں سے کسی ایک شخص کو پبلک میں لے آئے تا کہ دوسروں کو اس سے عبرت و تنبیہ ہو، چناں چہ زیر نقاب کارروائی ہو چکی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس لیے آج حسب قرارداد کانفرنس اس قوم کے ایک فرد کا حال مع اسناد و ثبوت پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ محض خیالات کی یکسانیت سے بدظنی نہیں قائم کر لی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سرقہ صرف خیالات کا نہیں کیا گیا بلکہ الفاظ و عبارت کا سرقہ کیا گیا ہے۔ پورے پورے پیراگراف نقل کیے گئے ہیں بلکہ جس مضمون سے سرقہ ہوا ہے اس کی صورت مسخ کر کے جابجا حذف و اضافہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس حیرت آباد عالم میں جرأت و جسارت کی ایسی ملعون مثالیں آپ کو کم ملیں گی جیسی آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔ کانفرنس کے سامنے جو طویل فہرست ہے اس کے سرخیل ادیب جلیل حضرت مولانا مولوی منشی محمد الدین صاحب المتخلص بہ خلیقی وسابق المکنی بہ ابی الآزاد و بعدہ ابی المعانی وحال

کنیۃ ابوالمعالی ہیں'' ۔

اس کے بعد ''الناظر'' نے ابوالآرا خلیقی کے سرقہ شدہ مضامین کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے ۔ یہ مضامین رسالہ ''نظام المشائخ'' اور ''اسوہ حسنہ'' میں کثرت سے شائع ہوتے تھے ۔حیرت انگیز بات ہے کہ ان رسائل کے مدیر ابوالکلام آزاد کے اسلوب تحریر سے اس قدر بے خبر تھے کہ وہ سارق کو پہچان نہ سکے ۔

''الناظر'' مزید لکھتا ہے ''اس وقت تک جس قدر مضامین ہماری نظر سے گزرے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکثر و بیشتر صنعت مسروقہ میں لکھے گئے ہیں اور چوں کہ ہمیشہ ہر دور میں آپ کا اسٹائل بدلتا رہا ۔آپ نظام المشائخ اور اسوۂ حسنہ کی جلدیں اٹھا کر دیکھیے آپ یہ فرق بہت جلد محسوس کرلیں گے ۔لیکن دور آخر میں چوں کہ الہلال پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ الہلال ہی کے کسی نہ کسی نمبر سے ماخوذ و مسروق ہے اس لیے ابوالکلامیت ہر جگہ بول رہی ہے ۔

سرقہ فن کے طور پر کیا جائے تو ہرج نہیں :

آل انڈیا احتساب کانفرنس ،سرقہ کی اس قدر شدید مخالف نہیں کہ محض ایک آدھ خیال کے سرقے پر کسی کی پگڑی اتار لی بلکہ حقیقت میں ان لوگوں کی مخالف ہے جو اس فن کی بحیثیت فن تو ہین کرتے ہیں ۔واقعہ یہ ہے کہ سرقہ ایک مرتب فن ہے اس کے جو اصول وضوابط ہیں اگر ان کو لحوظ رکھ کر پوری رازداری کے ساتھ انجام دیا جائے تو چنداں عیب نہیں ۔

''الناظر کے صفحات میں سرقہ شدہ مضمون کی اشاعت :

نثر میں سرقے کا دوسرا بڑا واقعہ ۱۹۳۰ء میں پیش آیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ سرقہ ''الناظر لکھنؤ'' کے صفحات پر جنوری ۱۹۳۰ء میں مولوی حکیم سید انیس شاہ ،احمد قادری، الرزاقی کے قلم سے شائع ہوا ۔ یہ وہی الناظر تھا جس نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا احتساب کانفرنس قائم کر کے سرقے کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا ۔

پنڈت کیفی کے مضمون کا سرقہ:

مولوی حکیم انیس شاہ نے پنڈت کیفی کے ایک خطبے شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم کو من وعن اپنے نام سے شائع کیا۔ یہ خطبہ الٰہ آباد کے رسالے ادیب بابت مارچ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا تھا۔ بعد میں یہ خطبہ پنڈت صاحب کی کتاب ''منشورات'' میں شامل کیا گیا۔ منشورات پنڈت کیفی کے مختلف خطبات کا مجموعہ ہے۔ یہ خطبے ہندوستان بھر میں دیے گئے تھے۔ پنڈت جی ان خطبات کی اشاعت سے پہلے نظر ثانی، ترمیم اور اضافے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن الناظر میں ان کے مضمون کی سرقہ شدہ صورت کی اشاعت کے بعد پنڈت نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور ہنگامی بنیادوں پر ۱۹۴۲ء میں منشورات کی اشاعت کا فیصلہ کیا تاکہ سارقین دوسرے خطبات پر ہاتھ صاف نہ کر سکیں۔ منشورات کے شروع میں ''پہلے ایڈیشن پر نوٹ'' کے نام سے ناشر کا نوٹ ملاحظہ کیجیے:

حضرت کیفی ابھی ان لکچروں اور مضامین [منشورات] کو اس صورت میں طبع کرنا پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان میں سے بعض کی نظر ثانی کرنی تھی جس کی ان کو اس وقت فرصت نہیں۔ لیکن جب ان کو یہ بتایا گیا کہ آپ کے مضامین کے صفحوں کے صفحے لوگ سرقہ کر رہے ہیں تو مسکرا کر فرمایا کہ اب ضرور شائع کر دو۔ کیوں کہ اب یقین ہو گیا کہ ان میں کچھ ہے اور وہ نشر و اشاعت کے مستحق ہیں۔

یہاں ایسے سرقہ بالنثر کی صرف ایک نظیر دی جائے گی:

حضر ممدوح نے جناب آزاد مرحوم کے سانحہ پر ایک مضمون لکھا تھا جو شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم'' کے عنوان سے ان کے نام پر الٰہ آباد کے مشہور مگر اب مرحوم رسالہ ادیب بابت ماہ مارچ ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا اور جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بہت مقبول ہوا۔ اس کے بیس برس بعد ایک صاحب مولوی حکیم سید شاہ انیس احمد قادری الرزاقی نے جنوری ۱۹۳۰ء سے لکھنؤ کے الناظر میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس کا عنوان تھا ''ادبا و ادبیات اردو''۔

اس سلسلے کے دوسرے نمبر مندرجہ الناظر بابت فروری ۱۹۳۰ء [جلد ۲۷، نمبر ۲] مولوی حکیم انیس احمد صاحب مذکورہ سطریں ہی نہیں صفحے کے صفحے ادیب کے مذکورہ صدر مضمون سے اپنی تحریر میں ملا کر بلا تکلف نقل کیے جاتے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ گویا وہ ان کے رشحات قلم ہیں۔ نہ اقتباس کے لیے واوین کا نشان ہے نہ ادیب کا حوالہ۔ نہ اصل مصنف کے قول کا ذکر، نہ ایسے ہی مبہم فقرے۔ ''یہ جوان کی نسبت کہا گیا ہے''۔ ''کسی نے ان کے متعلق ٹھیک لکھا ہے'' وغیرہ۔ تمثیل کے طور پر یہاں تشریح کی جاتی ہے:

ادیب، مارچ ۱۹۱۰ء	الناظر فروری ۱۹۳۰ء
۱۔ صفحہ ۱۱۴ کالم ۲ سطر ۵ [نیچے سے] [آزاد ''واقعی اسم با مسمّٰی تھے'' سے لے کر صفحہ ۱۱۵ کالم ایک، سطر ۶ تک:	۱۔ ۹، سطر ۵ [نیچے سے]: سے لے کر صفحہ ۱۰ سطر ۲ تک ۷ سطریں۔
۲۔ صفحہ ۱۱۵، کالم ۲، سطر ۶، ''یہ کہنا ایک امر واقعی ہے'' سے لے کر آزاد کی تصنیف سے ہیں'' تک	۲۔ صفحہ ۱۰، سطر ۴ سے سطر ۹ تک، ۶ سطریں،
۳۔ صفحہ ۱۱۶، کالم ۱، آخری آخری سطر سے سطر ۶ کالم ۲ تک، ''حق الامر یہ ہے'' سے نظارہ افروز کریں'' تک	۳۔ صفحہ ۱۰ سطر ۱۱ سے سطر ۱۴ تک، ۴ سطریں۔
۴۔ صفحہ ۱۱۸، کالم ۱، سطر ۱۳ سے ۱۴ تک، ''اور یہ صاحب ہمت'' سے فرماتے ہیں تک۔	۴۔ صفحہ ۱۱، سطر ۴ [نیچے سے] ایک سطر
۵۔ صفحہ ۱۱۹، کالم ۱، سطر ۱۰ سے سطر ۲۰ تک ''سب سے زیادہ غور کے قابل'' سے ''بیان کی ہے تک''	۵۔ صفحہ ۱۰، سطر ۱۰، سے سطر ۲۱ تک، ۷ سطریں

۶۔ صفحہ۱۲۰، کالم ۱، سطر ۱ سے شروع سطر ۵ تک ''مثنوی صبح امید کی تمہید'' سے شاہراہ بنا دی تک	۶۔ صفحہ۱۲، سطر ۱۹ سے صفحہ۱۳، سطر ۳ تک، ۱۰ سطریں۔
۷۔ صفحہ۱۲۰، کالم ۱، سطر ۲۰ سے صفحہ۱۲۱، کالم ۱، سطر ۹ تک	۷۔ صفحہ۱۳، سطر۴ سے صفحہ۱۴، سطر۱، تک ۲۳ سطریں
۸۔ صفحہ۱۲۱ کالم ۱، آخری سطر سے کالم ۲ سطر۲ تک، ''مگر نیرنگ خیال'' کے سر پہ ہے '' تک	۸۔ صفحہ۱۴، سطر۲ سے سطر۲۱ تک، ۲۰ سطریں
۹۔ صفحہ۱۲۲ کالم ۱، سطر سے سطر۱۴ تک ''آزاد اگرچہ'' سے ''کمیاب ضروری ہے'' تک	۹۔ صفحہ ۱۴، سطر ۵ سے سطر ۱۳ تک، ۹ سطریں۔
۱۰۔ صفحہ۱۲۲، کالم ۱، سطر ۱۶ سے کالم۲ سطر۵ تک ''میدان سخن'' سے ''پھر کہوں گا'' تک	۱۰۔ صفحہ۱۱۴، سطر۱۴، سے صفحہ۱۵، سطر۱ تک، ۱۲ سطریں۔

مختصر یہ کہ آزاد سے متعلق جو کچھ بھی ان حضرات نے لکھا وہ یا تو لفظ بہ لفظ جناب کیفی کے مضمون سے جوں کا توں یا اس سے ماخوذ اور اپنے الفاظ میں۔ اوپر دیئے گئے حوالہ بجنسہ بلا تصرف لفظی کے اصل مضمون مندرجہ ادیب سے لیے گئے ہیں۔

مال مسروقہ کی یہ لمبی فہرست دیکھ کر جناب کیفی نے مسکرا کر یہ فرمایا کہ میں غنیمت سمجھتا ہوں کہ سارق نے مسروقہ جیسا تھا ویسا ہی بازار میں لا کر رکھ دیا اس کا چہرہ نہیں بگاڑا۔ [۴۴]

ماہنامہ معاصر پٹنہ اور سرقہ:

اکتوبر ۱۹۴۳ء کے ماہنامہ ''معاصر'' پٹنہ میں سید علی اکبر قاصد نے جو خانوادہ پھلواری شریف کے فرزند تھے عصمت چغتائی کی ''ضدی'' کوثر کی کی مصنفہ کے ناول ''ہاجرہ''

کا چربہ ثابت کیا۔ یہ ناول انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۸۹۹ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہو چکا تھا۔ ۴۳ سال بعد اس کتاب کا چربہ عصمت چغتائی نے اتارا لطف کی بات یہ تھی کہ چربہ کرتے ہوئے اصل انگریزی ناول کو مشقِ ستم بنانے کے بجائے اردو ترجمہ پر انحصار کیا گیا۔[۴۵]

یورپی شعراء کے عربی فارسی شاعروں سے سرقے یا توارد:

یورپ کے ادب کی مشرقی تحریک عموماً اور جرمن ادب کی تحریک خصوصاً اس قابل ہے کہ اس پر مفصل تحقیق کی جائے۔ اس تحریک کی پیداور ترجمے بھی ہیں، جو زبانوں کو علمی و ادبی سرمائے سے بہرہ ور کرتے ہیں اور نظم و نثر کی وہ تصنیفات بھی ہیں جو مشرقی شاہکاروں کے تتبع میں یا ان سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔ ان کے علاوہ وہ مختلف اور مفید کتابیں بھی ہیں جو مشرق کے علوم و فنون، رسم و رواج تاریخ و جغرافیہ اور مختلف انسانی اور طبعی خصوصیات کے متعلق لکھی گئیں۔ بعض اوقات مشرقی طرزِ فکر اور گرمیِ تخیل مغربی شعرا کے کلام میں ایسے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے کہ شک بھی نہیں گزرتا۔ انگریزی شاعری ہی کو لیجیے۔ شیکسپیر [Shakespeare] ، شیلے [Shelley] ، کیٹس [Keats] ، سون برن [Swinburne] ، روسیتی [Rosetti] ، فرانسس ٹامسن [Francis Thomson] اور بہت سے دوسرے شعرا ایسے ہیں جن کی گرمیِ کلام، جذباتی گداز اور بلندیِ تخیل، ہمیں عربی اور فارسی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر شیلے کہتا ہے۔

She stood so robed in glory
That I beheld her not

[Epipsychidion]

وہ اپنے حسن کی تجلی میں اس انداز سے پوشیدہ تھی کہ میں اسے دیکھ نہ پایا۔
اس شعر کو غالب کے مندرجہ ذیل شعر کے برابر رکھ کر دیکھیے۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

[دیوانِ غالب اردو]

یا اقبال کا شعر سنیے۔

مرا ز دیدۂ بینا شکایتی دگر است
کہ چون بجلوہ در آیی حجاب من نظر است

[پیامِ مشرق]

مجھے اپنی چشم بینا سے ایک اور ہی شکایت ہے کہ اے محبوب! جب تو جلوہ افروز ہوتا ہے تو میری نگاہ خود میرے لیے ایک پردہ بن جاتی ہے۔

مغربی شعراء شرق کے سینے سے الہامی حرارت حاصل کرتے ہیں:

ایک انگریزی شاعر براوننگ کہتا ہے:

Thoughts hardly to be packe'd

Into a narrow act

Fancies that broke through language and escaped

[Rabbi ben Ezra]

میرے دل میں وہ خیالات تھے جن کی پہنائی ایک محدود عمل میں نہیں سما سکتی تھی اور وہ تخیلات تھے جو الفاظ کی حدود کو توڑ کر باہر نکل جاتے تھے۔

اب غنی کشمیری کا شعر ملاحظہ فرمایئے:

اگر لب از سخن گوئی فرو بندیم جا دارد
کہ نتوان از نزاکت تاب بستن معنی مارا

[دیوانِ غنی]

اگر میں سخن گوئی ترک کردوں تو بجا ہے کیوں کہ میرے معانی اتنے لطیف و نازک ہیں کہ الفاظ انھیں باندھ نہیں سکتے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہم انگریزی شعر کے مقابلہ میں کوئی عربی یا فارسی کا شعر ہی پیش کریں۔ اصل چیز یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی انگریز یا دوسرا یورپی شاعر مغربی دنیا کی سرد روحانیت اور بے کیف اقتصادی جدوجہد سے الگ ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر مشرق کے سینے سے الہامی حرارت حاصل کرتا ہے۔

یوروپی شاعری پر فارسی اثرات:

فرانسس ٹامسن کی ایک نظم کا ایک بند ہے۔

She went her unremembering way

She wnet away and left in me

The pang of all he partings gone,

And partings yet to be

[Daisy]

اس نے بے نیازانہ اپنا راستہ لیا اور چلی گئی اور میرے لیے ان ساری جدائیوں کا کرب ودرد چھوڑ گئی جو اب تک نوعِ انسانی پر گزر چکے ہیں یا آیندہ پیش آنے والے ہیں۔

یہاں شاعر اپنی محبوبہ کی جدائی کو اس قدر نا قابلِ برداشت سمجھتا ہے کہ اس کے خیال میں اسے زمان و مکاں کی حدود میں مقید کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک مشرقی قسم کے جذبے کی عکاسی ہے۔ انگریزی میں یہ اشعار فوق العادت معلوم ہوتے ہیں، مگر حبیب یغمائی جب کہتا ہے کہ

نجوید عمرِ جاویدان هر آنکو همچو من بیند
بیک شامِ فراق اندوه عمرِ جاودانی را

جوشخص میری طرح محض ایک شامِ فراق میں ایک عمرِ جاوداں کے غم واندوہ کا تجربہ کرے وہ کبھی عمرِ جاوداں کی خواہش نہیں کرے گا۔

تو ہمیں ٹامسن کا تخیل اور اس کا جذبہ فارسی شاعری کی روایات سے الگ محسوس نہیں ہوتا ۔فرانسس ٹامسن کی اسی نظم کا ایک اور بند ہے۔

Nothing begins and nothing ends

Thatis not paid with moan,

Fir we are born in other's pain

And perish in our own

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی ابتدا اور انتہا اپنے اندر درد وکرب لیے ہوئے نہ ہو،خود ہم پیدا ہوتے ہیں تو ایک دوسرے انسان کا درد والم ہمارے ہمراہ ہوتا ہے۔اور مرتے ہیں تو اپنے ہی درد وکرب میں۔

اس بند کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شیخ سعدی نے انگریزی میں شاعری کی ہو۔

مشرق کی پیروی میں تخلص کا استعمال:

یورپ کے شعرا اپنا نام یا تخلص شعر میں استعمال نہیں کرتے مگر کہیں کہیں غالباً فارسی کے اثر سے یہ بھی موجود ہے۔مثلاً شیلے [Shelley] کی مشہور نظم "To Jane, A Recollection" کے آخری بند میں۔

Thought thou art ever fair and kind

The forest ever green

Less oft is peace in Shelly's mind

Than calm in waters seen

اے محبوبہ!اگر چہ تو ہر وقت حسین اور مہربان ہے اور جنگل ہمیشہ سرسبز اور شاداب ہے، لیکن شیلے کے دل کو سکون کم نصیب ہوتا ہے اور سمندر کو زیادہ۔

یوروپی شاعری پر عربی کا اثر:

جب ٹینی سن [Tennyson] اپنی نظم لاکسلے ہال [Locksley Hall] میں اپنی محبوبہ کے قدیم مسکن کو دیکھ کر اپنی جوانی اور ناکام محبت کو یاد کرتا ہے اور اپنے رفقا سے کہتا ہے۔

Comrades leave me here while as yet is early morn,

Leave me here and when you want me sound upon the bugle horn

اے میرے ساتھوں! مجھے یہاں چھوڑ دو اور جب تک صبح کا سماں ہے مجھے یہیں رہنے دو مجھے یہیں رہنے دو اور جب تم چاہو کہ ہم واپس چلیں تو تم اپنا بگل بجا دینا، میں چلا آؤں گا۔

تو یہ امراؤالقیس کے معلقے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے:

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

''اے میرے دونوں دوستو! ٹھہر و تا کہ ہم مل کر محبوبہ کی یاد میں روئیں اور اس مسکن کو دیکھ کر آنسو بہائیں جو ریت کے ٹیلے پر دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے''۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ جب ٹینی سن نے یہ نظم لکھی وہ سر ولفر ڈ لائل کے سبعہ معلقہ کے انگریزی ترجمے سے متاثر تھا۔ ورنہ اپنے رفقا کو اس طرح خطاب کرنا جہاں عربی شاعری کی قدیم روایت ہے انگریزی شاعری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہائیڈل برگ سے متعلق ایک گیت کا یہ مصرع

Die jahre sind vergangen und ich bin ganz allin,

{from ich hab' mcin Herz Hcidelberg verloren}

''سالہا سال گزر گئے اور اب میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں''۔

قیس عامری سے منسوب اس مصرعے کی یاد دلاتا ہے:

تذکرت لیلی والسنین الخوالیا

''میں نے لیلیٰ کو اور گزرے ہوئے سالوں کو یاد کیا ہے''۔
اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ اس مصرعے میں جرمن شاعر مجنوں بنی عامر کا مرہونِ منت ہی ہو۔

جب شیلے کہتا ہے:

Life of lifeO the lips enkindle

with their love the breath between them

[Prometheus Unbound]

اے جانِ جاں! تیرے ہونٹوں میں وہ جادو ہے کہ وہ اپنے محبت کے جذبے کی بدولت ہر سانس کو ایک نئی زندگی بخشتے ہیں ۔تو اس کے کلام میں محبت کی وہ شدت اور جذبے کی وہ حرارت محسوس ہوتی ہے جو عربی شاعری ہی کا حصہ ہے۔ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لیس الفؤاد محل شوقک وحدہ
کل الجوارح فی ھواک فؤادہ

صرف میرا دل ہی تیری محبت کا مرکز نہیں ہے بلکہ میری تو یہ کیفیت ہے کہ تیری محبت میں میرا انگ انگ دل بنا ہوا ہے۔
یہ محض چند مثالیں ہیں جن سے عربی اور فارسی شاعری کی جذباتی گہرائی کا شعوری یا غیر شعوری اثر یورپ کی شاعری پر دکھانا مقصود ہے۔[۴۶]

دانتے کا سرقہ ابن عربی کی تصانیف سے:

اطالوی شاعر دانتے نے نہ صرف کیتھولک عقائد کا احیاء کیا بلکہ معراج کی احادیث نبویہ کی نقل کر کے گناہ گاروں کو سزایاب اور نیکوکاروں کو انعام یافتہ دکھایا۔دانتے کا فلسفہ عشق ابن عربی کے معروف فلسفۂ عشق کا چربہ ہے۔ابن عربی کی ''ترجمان الاشواق'' اور ''فتح الذخائر والاغلاق'' کے مضامین ہو بہو دانتے کے ہاں موجود ہیں۔

کامیڈی میں جہنم کا نمونہ ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ابن عربی نے جہنم کا نقشہ اقلیدس کے اصولوں پر دائروں کی شکل میں بنایا۔دانتے نے اس کی نقل کی۔کامیڈی کا نقشہ فردوس بھی ابن عربی کی من وعن نقل ہے۔جنت کی تعبیر میں دانتے نے دیگر تشبیہات بھی ابن عربی سے سرقہ کی ہیں یا مستعار لی ہیں۔[۴۷]

یورپ میں ادب کی مشرقی تحریک:

آرتھر رے می کی انگریزی کتاب ''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر'' جرمن ادب کی مشرقی تحریک پر پہلی کتاب ہے۔جرمن ادب کی یہ تحریک یوروپ کے مجموعی ادب کی مشرقی تحریک کا ایک اہم اورنمایاں حصہ ہے۔اس تحریک سے سرولیم جونس،سرالفریڈ لائل،فٹز جیرالڈ، والیٹر، وکٹر ہیوگو جیسے بڑے بڑے ستارے متاثر ہوئے،اس تحریک کی پیداوارترجمے بھی ہیں اورنظم ونثر کی وہ تصانیف بھی ہیں جومشرقی شاہکاروں کی تتبع میں یا ان سے متاثر ہوکر وجود میں آئیں۔شیکسپئر، شیلے،کیٹس، سون برن روسیتی ٹامسن کے کلام کی گرمی،جذباتی گدازاور بلندی تخیل عربی اورفارسی شاعری کا اثر ہے۔مشرقی تحریک کے نتیجے میں عربی و فارسی کے تراجم سے یوروپی شعراءاورادباء نے استفادہ کیا۔یہ استفادہ اخذ، ترجمہ،توارد،سرقہ،استفاضہ کی صورت میں ان کی ادبی تخلیقات میں نمودار ہوا۔ڈاکٹر آرتھر رے می کی کتاب ترجمے،سرقے،توارد،اخذاوراثرات کی بحث کوتقابلی جائزے کے ذریعے عیاں کرتی ہے۔رے می نے گوئٹے کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مشرق سے بے حد متاثر تھا۔عربی لباس پہنتا تھا،حقہ پیتا تھا،مشرق نے صرف اس کی شاعری کونہیں اس کے طرز زندگی کو بھی متاثر کیا تھا۔رے می کی کتاب کا عمدہ ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے کیا جو ۱۹۶۷ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی نے شائع کیا تھا۔[۴۸]

گوئٹے کے کلام میں سرقہ نہیں ترجمہ ہے:

گوئٹے نے قرآن سیرت رسول اور تعلیمات اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ قرآن کی دوسری صورت سورہ بقرہ کے شروع کی آیات کو قرآن کا خلاصہ اور اسلام کی تعلیم کی روح سمجھتا تھا۔ گوئٹے کے ''دیوان شرقی'' میں جو اس کے اواخر ایام حیات کی یادگار ہے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر اسلام کا کتنا اثر تھا وہ کہتا ہے ''مشرق بھی خدا کا گھر ہے اور مغرب بھی''۔

کیا یہ ''للہ المشرق والمغرب'' کا ترجمہ نہیں ہے؟ اسی طرح جب گوئٹے لکھتا ہے کہ ''خداوندا! جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالوں، یا جب بھی شعر کہوں تو سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی کر''۔

تو کیا ہمیں اھدنا الصراط المستقیم'' کی آیت یاد نہیں آتی؟

دیوانِ شرقی کا ایک شعر ہے:

''اگر اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں تو ہم یقیناً اسلام ہی میں جیتے اور اسلام ہی میں مرتے ہیں''۔[۴۹] گوئٹے کے ان اشعار کو پڑھنے والے بعض نقاد اسے سرقہ یا توارد قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ ترجمہ اور اخذ و استفادہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عربی زبان میں سرقے کی روایت:

ماوردی کو الاحکام السلطانیہ کے مصنف اور افکار سیاسیہ میں اسلامی اقتدار کے داعی ہونے کا جو فخر حاصل ہے اس میں ایک مصنف اس کا سہیم و شریک ہے مگر اسے ماوردی جیسی شہرت اور قبولیت عامہ نہ حاصل ہوسکی۔ یہ مصنف قاضی ابویعلیٰ حنبلی ہے۔ اس نے بھی ماوردی کے زمانہ میں الاحکام السلطانیہ نامی کتاب تحریر کی اور اسلامی سیاسی افکار متعین کیے۔ قاضی ابویعلیٰ کی کتاب بار اول قاہرہ کے مشہور ''مطبع مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ'' سے

۱۳۵۷ھ [۱۹۳۸ء] شائع ہوئی۔

اس کا نام محمد بن حسین بن محمد بن خلف بن احمد الفراء اور کنیت ابویعلیٰ ہے۔ وہ ۲۸ محرم ۳۸۰ھ میں پیدا ہوا اور شب دوشنبہ ۱۹/رمضان ۴۵۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

جنازہ میں شرکاء کی تعداد بے حساب تھی۔ بغداد کے بازار بند رہے اور جنازہ کے ساتھ نقباء، امراء، قضاۃ اور فقہاء بہت بڑی تعداد میں شریک رہے۔ اسے اس کی وصیت کے مطابق ان کپڑوں میں کفن دیا گیا جو اس نے خود اس مقصد کے لیے کات کر تیار کیے تھے اور امام احمد بن حنبل کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ قاضی ابویعلیٰ نے پانچ سال کی عمر میں حدیث کی سماعت کی۔ ابوالقاسم ابن حبابہ، ابوالقاسم السراج اور اپنے والد ابوعبداللہ وغیرہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ طلب حدیث میں بغداد کے علاوہ مکہ، دمشق اور حلب کا سفر کیا۔ وہ خلیفہ قائم بامراللہ [۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ] کے عہد خلافت میں ۴۳۲ھ میں بغداد مستقل قیام کی غرض سے آیا۔ اس کے ساتھ علماء اور طلبہ کا ایک جم غفیر تھا۔ جب قاضی القضاۃ ابن ماکولا شافعی کا ۴۴۷ھ میں انتقال ہوا تو خلیفہ نے قاضی ابویعلیٰ کو دارالخلافت کا قاضی بنانا چاہا۔ اس نے ابتداء میں منصب قضاء قبول کرنے سے انکار کیا مگر بعد میں خلیفہ کے پیہم اصرار سے اسے منظور کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ شاہی سواری کے جلوس میں شریک نہ ہوگا۔ استقبال کے لیے نہ جائے گا اور دربار سلطانی میں حاضری نہ دے گا ''طبقات حنابلہ'' کے مصنف نے فقہائے حنابلہ کے پانچویں طبقے میں اسے شمار کیا ہے۔ اس کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے جامع منصور میں امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کی مسند درس پر فائز ہو کر درس حدیث دیا تو لوگ نہایت کثرت سے اس میں شریک ہوئے۔ لوگوں کا مجمع اتنا زیادہ تھا کہ درس کے بعد جمعہ کی نماز میں نمازیوں نے جگہ کی تنگی کی وجہ سے فرش مسجد کے بجائے ایک دوسرے کی پیٹھوں پر سجدے کیے۔ صاحب ''طبقات الحنابلہ'' کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کی سماع کے لیے اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا۔

قاضی ابویعلیٰ کی تصانیف کی تعداد اکیس سے زیادہ ہے۔

ابویعلیٰ کی ''الاحکام السلطانیہ'' مندرجہ ذیل پندرہ فصلوں پر مشتمل ہے:

[۱] امامت کے مسائل، [۲] تقرر حکام، وزارت، امارتِ اقلیم، امارتِ جہاد، ولایتِ قضاء، ولایت مظالم کے مباحث، [۳] نقیب الاشراف کا تقرر، [۴] امامتِ صلوٰۃ [۵] امارتِ حج، [۶] امارتِ صدقات [۷] تقسیم فئی، وغنیمت [۸] جزیہ وخراج کے مسائل [۹] مختلف شہروں کے احکام، [۱۰] غیر آباد زمینوں کی آبادکاری اور آب پاشی کے لیے کنویں کھودنے کے احکام، [۱۱] چراگاہ اور عام مفاد کے مقامات کے احکام، [۱۲] جاگیر کے احکام، [۱۳] قیام دیوان اور اس کے حکام کا بیان، [۱۴] جرائم کے احکام، [۱۵] احتساب کے احکام۔

ابوالحسن ماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' بھی انھیں مباحث پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنی پوری کتاب کو بیس ابواب پر منقسم کیا ہے۔ ان میں سے چودہ ابواب تو بعینہ وہی ہیں جو ابو یعلیٰ کے یہاں ہیں۔ ابویعلیٰ کی فصل دوم ''تقرر حکام'' کو ماوردی نے پانچ مستقل ابواب میں بیان کیا ہے، اور یوں دونوں کتابوں کے تمام عنوانات ایک جیسے ہیں۔ صرف ماوردی کے ہاں ایک عنوان زائد ہے جو ابویعلیٰ کی کتاب میں نہیں ہے اور یہ اس کتاب کا پانچواں باب ہے جس کا عنوان ''مصالح ملکی کے لیے جنگ'' ہے اور جسے اس نے جہاد سے الگ بیان کیا ہے جب کہ ابویعلیٰ کے ہاں یہ بحث امارت جہاد کے ضمن میں آ گئی ہے۔

جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ دونوں میں سے کوئی ایک کتاب نقل ہے تو اس بات کا پتہ چلانا چنداں دشوار نہیں رہ جاتا کہ اصل کون سی کتاب ہے، اور نقل کون سی۔ اگر چہ ان کتابوں کے سنین تالیف معلوم نہیں ہیں مگر قرینۂ غالب یہی ہے کہ ابوالحسن ماوردی نے اپنی کتاب پہلے لکھی اور اس کے بعد ابویعلیٰ فراء نے۔ ابویعلیٰ کے پیش نظر یہ کوشش ہے کہ ماوردی کی کتاب میں امام احمد بن حنبلؒ کے اقوال درج نہیں جس سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ان کے اپنے افکار

سیاسیہ نہ تھے۔اس لیے انھیں اصول کو پیش نظر رکھ کر ان سے متعلق امام احمد کے اقوال کو بالتفصیل بیان کر دیا جائے۔چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ماوردی کے اصول کہیں بعینہ اور کہیں تلخیص کے ساتھ اس نے نقل کر کے ان کے ضمن میں امام احمد کے اقوال کی تفصیل دی ہے اور دوسرے ائمہ کے اقوال سے بحث نہیں کی ہے۔علمی دیانت کا یہ اقتضاء تھا کہ ابویعلی اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر دیتا مگر اس عہد میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں جب کہ لوگوں نے پوری کی پوری کتاب نقل کر کے اپنے نام سے موسوم کر لی اور اصل کا کوئی ذکر نہ کیا [بلکہ آج بھی یہ روش نادر الوقوع نہیں]۔[۵۰]

علی طنطاوی نے اپنی کتاب ''مقالات طنطاوی'' میں ڈاکٹر احمد امین مصری کے سرقے کا ذکر کیا ہے۔ضحی الاسلام،فجر اسلام کے نامور مصنف ڈاکٹر احمد امین نے ابن جوزی کی کتاب ''صید الخاطر'' کا سرقہ فیض الخاطر'' کے نام سے کیا ہے۔اس کتاب کے مضامین بھی ابن جوزی سے ملتے جلتے ہیں۔مگر علامہ طنطاوی کے خیال میں سرقہ بھی نہایت کمتر درجے کا ہے۔

سیوطی کی شہرت بسیار نویس کے طور پر ہے،ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں اجزاء کے اجزا نقل کر لیتے ہیں۔[۵۱]

مولانا مودودیؒ کا توارُد:

توارد اور سرقے میں فرق ہے۔سرقہ دانستہ ہوتا ہے توارد نادانستہ۔ [بحر الفصاحت،ص ۱۲۲۸]

توارد کی ایک خوبصورت مثال سورہ نور کی آیت ۳۵ کے ضمن میں مولانا مودودی کا ترجمہ ہے یہ ترجمہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔اسی آیت کا ترجمہ مولانا ابوالجلال ندوی کے قلم سے ان کی کتاب ''کتاب الہدیٰ'' میں شائع ہوا۔یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۲۶ء میں طبع ہوئی۔اس کتاب پر یعقوب حسن کا نام درج ہے۔سید سلیمان ندوی نے اس کا دیباچہ تحریر کیا

ہے ۔لیکن اصلاً یہ کتاب مولانا ابوالجلال ندوی کے قلم سے ہے اس کی تفصیلات جریدہ کے شمارہ ۲۳ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں ۔[۵۲]

ترجمہ ابوالجلال ندویؒ	ترجمہ ابوالاعلیٰؒ مودودی
اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق کہ اس میں ایک چراغ ہے، چراغ ایک شیشہ میں ہے، وہ شیشہ گویا چمکتا ہوا تارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا گیا ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی اس کا تیل روشن ہونے کو ہے گو اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ اپنے نور کی طرف جس کو	اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے [کائنات میں] اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہے چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی جس کا تیل آپ سے آپ ہی بھڑک پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے
چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۔[۵۳]	اس طرح روشنی پر روشنی [بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں] اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے ۔

مولانا مودودی کے سورہ النحل کے ترجمے میں بھی ایسے توارد ملتے ہیں ۔اس سلسلے میں تفصیلی تقابلی مطالعے کی ضرورت ہے ۔

اردو نثر میں سرقہ بازی کی تاریخ:

اس موضوع پر آج تک کسی نے توجہ نہیں کی لہذا اردو ادب کا دامن اس حوالے سے ابھی تک خالی ہے۔ہم نے کوشش کی ہے کہ سرقہ سے متعلق جو معلومات مل سکتی انھیں جمع کر دیا جائے تا کہ مستقبل میں کوئی محقق اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر سکے۔

محمد حسین آزاد کے سرقے:

''محمد حسین وہ ساحر ہے جس کی ''گپ'' بھی بقول شبلی وحی معلوم ہوتی تھی۔مہدی الافادی نے آزاد کو''اردو کے عناصر خمسہ میں شامل کیا ہے۔ڈاکٹر عبدالودود کا دعویٰ تھا کہ آزاد انگریزی نہیں جانتے تھے۔ڈاکٹر کشفی کی تحقیق ہے کہ آزاد انگریزی جانتے تھے۔اس بات پر اتفاق ہے کہ آزاد کے بہت سے مضامین اور کتابیں انگریزی ادبیات کا سرقہ، چربہ، استفادہ اور استفاضہ ہیں۔کشفی صاحب کی تحقیق کے مطابق ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار''، ''علمیت اور ذکارت کے مقابلے'' جانسن اور ایڈیسن کے مضامین کا اعلیٰ ترین ترجمہ ہیں۔

ڈاکٹر صادق نے نیرنگ خیال کے مضامین کے انگریزی ماخذات اور توبۃ النصوح کے ماخذ کا بھی سراغ لگایا اور تحقیقات پیش کیں۔

''سخن دانِ فارس کے ان ابواب کا [پہلا، چھٹا اور ساتواں،حصہ دوم] دوسرا اہم ماخذ مالکم صاحب کی تاریخِ ایران ہے۔ان اطلاعات کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، تقریباً تمام اطلاعات جو سخن دانِ فارس کے ان ابواب میں درج ہیں، اس تصنیف سے [اصولاً تالیف ہونا چاہیے] ماخوذ ہیں،لیکن تین اقتباسات کے سوا، جہاں آزاد نے اس تصنیف [تالیف] کی طرف اشارہ کیا ہے،انھوں نے کہیں بھی اس سے استفادے کا ذکر نہیں کیا''۔[۵۴]

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ آزاد انگریزی جانتے تھے، کچھ الفاظ معلوم ہوں تو اور

بات ہے۔ میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ انھوں نے آبِ حیات اور سخندانِ فارس کی تصنیف میں "مستشرقین یورپ کی علمی کاوشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے"۔ میں اس وقت صرف اظہارِ رائے پر اکتفا کرتا ہوں دلائل پیش کرنے کو تیار نہیں ۔[۵۵]

"جو شخص ایک پرانی رباعی کو سوداؔ سے منسوب کرکے فاخر مکین کی ہجو بنا دیتا ہے، جو بیدلؔ اور جعفر زٹلی کے بیچ کے معاملے کو جعفر اور سوداؔ کا معاملہ بنا دیتا ہے، جو قاسمؔ کے منشاء کے برعکس مرزا مظہر جانِ جاناں کے قاتل کو سنی قرار دیتا ہے، جو جھوٹ موٹ معرکے تصنیف کرتا ہے یا تذکروں سے بے ضرر مسابقتوں کو اٹھا کر معرکوں میں تبدیل کر دیتا ہے، جو یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ بیس سال تک دن رات ذوقؔ کی حضوری میں رہا، حالاں کہ ذوقؔ کے انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً ساڑھے چوبیس سال تھی، جو خود غزلیں کہہ کر ذوقؔ کے نام سے ان کے کلام میں شامل کر دیتا ہے، وہ دور دور تک محقق نہیں، ادبی جعل ساز ہے۔ بحیثیت راوی اس کی حیثیت صفیرؔ بلگرامی، شادؔ عظیم آبادی، نصیر حسین خیالؔ اور مفتی انتظام اللہ شہابی سے بہتر نہیں"۔[اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند، انجمن ترقی اردو، کراچی ۲۰۰۰، ص ۱۰۰]

"مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہ اس بدیہی مشابہت سے پیدا ہوا جو جانسن کے "Voyage of Life" اور آزادؔ کے مضمون "سیرِ زندگی" میں نظر آئی۔ موازنہ کرنے پر یہ انگریزی مضمون کا لفظ بلفظ ترجمہ ثابت ہوا"۔[۵۶]

آزاد کا دفاع:

نیرنگ خیال کی بحث میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کا دفاع کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق نے کہ "آزادؔ نے ان تراجم کو اپنا مال ظاہر کیا اور دوسروں کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر شہرت حاصل کی"۔ اس حوالے کے بعد بعض شوخ چشم لکھنے والوں نے آزادؔ پر سرقے کا الزام بھی عائد کیا، تاہم نیرنگِ خیال کے پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تحقیق کے مطابق انگریزی سرورق پر یہ عبارت بھی ملتی ہے:

"Gems from west and east

or

The land of fact and fancy

being

a series of allegorical and other eassy based on the rambler and spectator and on oriental lore"

ڈاکٹر ذوالفقار اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ اس اعتراف کے بعد ڈاکٹر محمد صادق کا یہ انکشاف کچھ بے ضرورت سا ہو جاتا ہے[۵۷]

علامہ نیازؒ فتح پوری کے سرقے:

سرقہ نگاری میں جناب علامہ نیاز فتح پوریؒ نے عالم گیر شہرت حاصل کی، ان کی سرقہ نویسی کے چرچے ان کے دورِ عروج میں عام ہو گئے تھے۔ اس باب میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے انھیں سلسلہ وار مضامین کا مسودہ اشاعت کے لیے دیا تو شروع کے مضامین انھوں نے اپنے نام سے شائع کر لیے۔ مولانا مودودیؒ نے احتجاج کیا لہٰذا بقیہ مضامین ان کے نام سے شائع کر دیئے گئے۔[۵۸]

''فراست الید'' کیرو کی کتابوں کا چربہ ہے ہاتھوں کے عکس اور متن کیرو سے لیے گئے ہیں، مختلف دائرہ ہائے المعارف [انسائیکلوپیڈیا] سے تراجم کر کے باب ''استفسارات'' میں وہ علم کے موتی بکھیرتے تھے۔ یوسف بخاریؒ صاحب کی روایت ہے کہ کئی بار علامہ کی خواہش پر انھوں نے ان کا گھڑا ہوا سوال باب استفسارات کے لیے بھیجا اور اس کا تفصیلی جواب جو پہلے سے سرقہ یا ترجمہ شدہ تھا شائع ہو گیا۔

''ترغیبات جنسی'' ہیولاک ایلیس کی شہرہ آفاق کتاب Studies in the Pcychology of Sex کا چربہ ہے۔ نیازؔ کی کتاب ''انتقادیات'' کا مضمون ادبیات اور

اصول نقد ولیم ہنری ہڈسن کی کتاب An introduction to the Study of Litrature کا سرقہ ہے۔انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ملحق دعوۃ اکیڈیمی کے رسالے ''دعوۃ'' میں نیاز فتح پوری کے خدا نمبر کو بھی سرقہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے ثبوت و شواہد پیش کیے گئے ہیں۔نیاز صاحب نے مولانا مودودیؒ کے کن مضامین کا سرقہ کیا اس کی تفصیلات بھی درج ہیں۔یہ مضمون پروفیسر اختر راہی نے تحریر کیا ہے۔یہ مضمون کتابت کے وقت گم ہوگیا ہے لہٰذا اس کا مکمل حوالہ فی الحال پیش نہیں کیا جا سکتا۔مجنوں گورکھپوری کے ''جن'' اور غیر محسوس دنیا سے متعلق اہم مضامین نیاز صاحب نے اپنے نام سے شائع کر لیے تھے۔دارالمصنفین اعظم گڑھ کی کتاب سیرالصحابیات کا سرقہ بھی نیاز صاحب نے کیا حسن مثنیٰ ندوی کی روایت کے مطابق نیاز صاحب نے اپنے داماد کی کتاب بھی سرقہ کی تھی جو خود کسی کتاب کا سرقہ تھی۔اردو میں سرقہ بازی کی تاریخ میں نیاز صاحب کو خاص مقام حاصل ہے اور ان کے سرقوں کی تعداد ان گنت ہے۔انگریزی زبان سے ان کے بیشتر سرقہ شدہ مضامین کا ماخذ بیرسٹر حسن امام کا کتب خانہ تھا جہاں وہ اکثر تشریف لے جاتے اور انگریزی کتابیں پڑھتے ہوئے متعلقہ حصوں کو قلم زد کرتے اور ان کا جیسا تیسا ترجمہ کر کے مضامین شائع کر لیتے۔عموماً یہ ترجمہ بھی ناقص اور نامکمل ہوتا۔انگریزی متن کے جو حصے مشکل ہوتے یا جن کی تفہیم نیاز صاحب کے لیے مشکل ہوتی انھیں چھوڑ کر خالی جگہ اپنی بلند خیالی اور الیلی انشاء پردازی سے اس طرح پُر کر لیتے تھے کہ سرقے پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔انہی غلط سلط محرف سرقوں سے وہ کتابیں مرتب کر ڈالتے۔حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے پاس ذخیرہ حسن امام کی وہ تمام کتابیں موجود تھیں جن سے نیاز صاحب نے سرقہ کیا تھا اور ان کتابوں پر نیاز صاحب کے اشارات اور نشانات بھی محفوظ تھے۔اب یہ کتب بیدل لائبریری شرف آباد میں محفوظ ہیں۔حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی تحقیق تھی کہ عربی، اردو، فارسی، ترکی اور انگریزی میں نیاز فتح پوری سے بڑا سارق پیدا نہیں ہوا۔ندوی صاحب یہ بھی بتاتے تھے کہ قاضی غفار نے جب

جبران کی عربی کتاب سے ترجمہ کرتے ہوئے ''اس نے کہا'' کے اوراق کا سرقہ کیا تو اس کا ایک صفحہ یا تو چائے پیتے ہوئے الٹ گیا تھا یا اس کتاب میں موجود نہ تھا لہذا اس سرقہ شدہ ترجمہ سے وہ پورا صفحہ غائب ہے۔

کرشن چندر کا سرقہ:

دیگر سرقوں کے ضمن میں جناب حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے رسالے مہر نیم روز میں شائع ہونے والے خطوط اوران کے بعض نوٹس سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ذیل میں درج ہیں:

دلی سے جو چمنستان نکلتا تھا اس میں ایک صاحب نے کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کے بارے میں ایک عجیب وغریب مضمون لکھا تھا۔انھوں نے بھی دلائل وشواہد دے کر ثابت کیا تھا کہ کرشن چندر نے خیالات اورالفاظ کہاں کہاں سے لیے ہیں ۔ مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے دل پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں چھوڑا تھا۔[۵۹]

مراۃالشعراءسرقے کا شاہکار:

حال ہی میں تنہا صاحب نے جو تذکرۂ شعراء بنام مراۃ الشعراء دو جلدوں میں چھپوایا ہےاور جس میں ''ولی دکنی سے لے کرمحمد یحیٰ تنہا'' تک جملہ شعرائے اردو کے حالات ہیں ۔ہر شاعر کے ۲۷نشتر جمع کئے گئے ہیں اور لطیفہ در لطیفہ یہ ہے کہ وہ ۲۷نشتر میر کے بھی جمع نہ ہو پائے نہایت پھسپھسا انتخاب ہے ۔اگر انھیں ۲۷نشتر کے بجائے ۲۷لٹھ کہا جائے تو بے جا نہیں!

حالات میں تحقیق کا یہ عالم ہے کہ شروع میں تو میں نے کتاب کے حاشیوں پر نوٹ لکھنے کی ابتدا کی اور یہ سوچا کہ انھیں مرتب کر کے ایک مضمون کی شکل دے دوں گا لیکن جب وہ غلطیاں بجائے خود ایک تصنیف بننے کی منزل میں آنے لگیں تو گھبرا کر پنسل رکھ دی۔

''مراۃ الشعراء'' پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر اس تذکرے کے نہ ہونے سے ہمارے ادب میں کون سی کمی تھی؟ اور کس معیار و اعتبار سے فاضل مصنف نے اسے لکھ کر [اپنا وقت تو خیر ٹھیک ہی صرف کیا!] ہمارا وقت کھویا!

مراۃ الشعراء بھی ملاحظہ فرمایئے اور اس میں جو'' آبیاریاں'' کی گئی ہیں ان کی قلعی کھولیے۔[٦٠]

پروفیسر عقیل کا سرقہ:

پروفیسر سید محمد عقیل نے اقبال کے ایک ''غیر مطبوعہ'' خط کو ایک ''نئی دریافت'' کے طور پر'' ہماری زبان'' ۲۲/مارچ ۱۹۹۷ء میں پیش کیا تھا اس مضمون پر نقد کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے اپنے مضمون ''علامہ اقبال کے ایک نو دریافت خط کے بارے میں'' میں بتایا کہ جس خط کو غیر مطبوعہ کہا گیا ہے وہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں موجود ہے۔[٦١]

حکیم الامت کا سرقہ: الزام یا حقیقت

''مولانا تھانوی نے مرزا قادیانی کی مختلف کتابوں کی بعض عبارات اپنی کتابوں میں من وعن نقل کی ہیں۔ ہم مزید تحقیق تو اہل تحقیق کے سپرد کرتے ہیں۔ اس وقت مولانا تھانوی کی ایک کتاب ''المصالح العقلیہ'' زیر نظر ہے۔

مرزا قادیانی نے اپنی کتاب کشتی نوح میں پنج وقتہ نمازوں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء کے اوقات کے تعین کی وجہ بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا مولانا تھانوی نے اس کی من و عن نقل اپنی مذکورہ بالا کتاب میں کی''۔ اس دعویٰ کے بعد مولف کتاب ''شاہ حسن گرویزی'' میں ص ۵۵۴ سے لے کر ۵٦٦ تک دونوں کتابوں کے حوالے آمنے سامنے نقل کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مرزا غلام احمد کی کتاب ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کے کچھ اقتباسات کا بھی موازانہ پیش کیا ہے۔ ان طویل اقتباسات کے بعد ان کا تبصرہ درج ذیل ہے:

اسلامی اصول کی فلاسفی ۱۸۹۶ء اور کشتی نوح ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی جبکہ ''المصالح العقلیہ'' یکم رجب بروز جمعرات ۱۳۳۴ھ کو ختم ہوئی اس لحاظ سے عیسوی سن ۱۹۱۶ء قرار پاتا ہے۔اس سرقے کے ضمن میں علامہ ڈاکٹر خالد محمود نے جامعہ اشرفیہ کے رسالے ''الحسن'' میں سرقے کے الزام کو رد کرنے کے لیے ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایک اور اہل حدیث مصنف کی تحریروں سے یہ سرقہ کیا تھا اور مولانا تھانوی کے پیش نظر اس مصنف کی اصل تحریریں تھیں جب کہ مرزا صاحب نے سرقہ کیا ہے۔ یہ موقف بہ ظاہر وزنی ہے لیکن مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔[۶۲]

متفرق سرقے:

مہر نیم روز میں شائع ہونے والے بعض خطوط سے بھی سرقوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چند خطوط درج ذیل ہیں۔اس وقت میرے ذہن میں کچھ عرصے پہلے کے دو واقعات ابھر رہے ہیں ایک دلی کے کسی رسالے میں چند ماہ قبل کسی ہندو دوست نے موپاساں کا کافی مشہور افسانہ "The Necklace" ''قیمتی ہار'' کا عنوان دے کر اسے اردو میں ترجمہ کر کے مقامی ناموں اور پس منظر کے ساتھ.......... اپنے نام سے چھپوایا تھا۔

دوسرا کچھ عرصہ گزرا جب جناب شوکت صدیقی کراچی سے روح ادب کو ترتیب دیتے تھے۔ روح ادب کے ایک شمارہ میں ایک مشہور اردو ڈرامہ نویس کا ڈرامہ نظر سے گزرا۔آسکر وایلڈ کے ڈرامے [The Importance of Being Earnest] من وعن نقل تھی۔صرف کرداروں کے نام دیسی تھے۔

۵/ اپریل ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ ڈھائی بجے سے سوا تین بجے دوپہر تک ریڈیو پاکستان [کراچی] سے جنوبی ایشیا میں سننے والوں کے پروگرام میں جناب پرویز رومانی کا ''افسانوں کی بستی'' نشر ہوا۔جسے شمس الدین بٹ نے پیش کیا۔

مجھے اب جناب پرویز رومانی سے پوچھنا ہے کہ ''افسانوں کی بستی'' کا امریکن

ناول [Leave her to Heaven] کے ساتھ اس حد تک توارد کا جواز آپ کیا پیش کرتے ہیں؟ کیا اسے خیالات اور پلاٹ کا توارد کہا جا سکتا ہے؟

ہیرو کا ادیب ہونا، اپنے چھوٹے اور اپاہج بھائی پر جان چھڑکنا، ہیروئی کی محبوبہ اور بیوی کو اس میں ڈبو دینا، پھر خود سیڑھیوں سے جان بوجھ کر پھسلنے سے ہونے والے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرنا .... آخر میں خودکشی کر لینا لیکن اپنی رقیبہ کو پھنسوانے کے لیے چند بناوٹی شہادتیں چھوڑ جانا۔

عدالت کا سین۔[۶۳]

محمد یونس بٹ کے سرقے:

''محمد یونس بٹ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر [ایم بی بی ایس] ہیں اور فن کے لحاظ سے مزاح نگار ہیں۔ اب تک ان کی بیس سے زائد شگفتہ تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے ہاں پہلی سے آخری کتاب تک مشتاق احمد یوسفی کے اثرات موجود ہیں، بلکہ خود یوسفی موجود ہیں۔ ان کے ہاں اثرات نے ''سرقہ'' کا روپ دھار لیا ہے۔ یوسفی کے جملے ایسے ہیں جو یونس بٹ نے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے نام منتقل کر لیے ہیں، بعض اوقات تو ذرا سی تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی''۔ خوشاب سے نکلنے والے سہ ماہی رسالے ''شبیہہ'' نے مشتاق احمد یوسفی نمبر میں ص ۲۸۸ سے ص ۳۲۰ تک سرقہ شدہ جملے نقل کیے ہیں جو سرقہ کا شاہکار ہیں۔ یونس بٹ کو سرقہ کرنے میں شاید بے حد روحانی تسکین میسر آتی ہے، اس بارے میں وہ خود اپنی معذوری بیان فرماتے ہیں:

> ''اب آپ کو کیا بتائیں، جس سیانے کی بات یاد رہتی ہے، اس کا نام یاد نہیں رہتا، جس کا نام یاد رہتا ہے اس کی بات یاد نہیں رہتی''۔

اس بحث میں مشتاق احمد یوسفی کی رائے بھی پیش نظر رکھی جانی چاہیے:

''نئے لکھنے والوں میں سب سے ذہین اور طباع ڈاکٹر
یونس بٹ ہیں، لیکن انھوں نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا، افتخار عارف
نے انھی کی تقریب میں کہا تھا کہ ڈاکٹر یونس بٹ واوین سے الرجک
ہیں، تعریف بھی کی تھی، لیکن اس خامی کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اب
چوں کہ انھیں کالم کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے اور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، تو وہ
اس Pitfall میں گر جاتے ہیں کہ مثلاً English Jokes کا ترجمہ کر
دیا، یا اپنے ہم عصروں کے جملوں کو جوں کا توں، یا تھوڑی رد و بدل
سے، یا ان کے خیالات کو مختلف انداز میں پیش کر دیا۔ عام پڑھنے والا
اخبار کا، وہ تو نہیں جانتا اس کو وہ تو داد دے گا، تو وہ بہت پاپولر بھی
ہو جائیں گے، مگر کوئی دن تو آئے گا، جب محاسبہ ہو گا اور ظاہر ہے جو
نقاد ہو گا وہ باخبر آدمی ہو گا تو اس میں پھر نقصان یہ ہو گا کہ ان کا اپنا بھی
جو Contribution ہے وہ بھی مسروقہ میں شامل ہو جائے گا، حالاں
کہ جیسا فقرہ ڈاکٹر یونس بٹ بنا سکتے ہیں ویسا فقرہ ہم نہیں لکھ سکتے،
لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے سے کم تر درجے کے لکھنے
والوں سے اس طرح استفادہ کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر یونس بٹ کی ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں جس کی صدارت خود مشتاق احمد یوسفی کر رہے تھے اور جو لاہور کے کسی پنج ستارہ ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی، صاحب صدر کو خطبۂ صدارت میں یہ تک کہتے ہوئے سنا کہ:

''میں یونس بٹ صاحب کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ
مجھے کم پڑھا کریں، اگر مجھے پڑھنا ضروری ہے تو مجھے Quote نہ
کریں اور اگر مجھے Quote کرنا بھی ضروری ہے تو خدارا واوین

میں کیا کریں اور اگر میرے جملے بڑھ جائیں تو اپنے داوین میں کرلیا کریں، اس طرح کم از کم ان کے جملے، میرے کھاتے میں تو نہیں پڑیں گے۔''

طارق حسین نے ''یوسفیات'' میں کچھ ایسے جملے دیے ہیں جو یا تو مشتاق احمد یوسفی کے جملوں کا من وعن چربہ ہیں یا ان کے جملوں سے ہی تراشے گئے ہیں، سرقے کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے یونس بٹ پر بلیغ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزی کے معروف نقاد جانسن نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو رائے دی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر یونس بٹ کی ہر تصنیف کے بارے میں کل ہر صاحب رائے کی یہی رائے ہو:

"This book is both good and orignal. But unfortunately where it is good, it is not orignaland where it is orignal, it is not good". [295] [۱۴]

مشتاق احمد یوسفی کے سرقے یا توارد یا اثر:

رشید احمد صدیقی	مشتاق یوسفی
ہر چارپائی، چارپائی نہیں ہوتی، کہنے کو تو پلنگ، پلنگڑی، چھپر کھٹ، مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔	اردو میں چارپائی کی جتنی قسمیں ہیں، اس کی مثال اور کسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مل سکے۔ کھاٹ، کھٹا، کھٹولہ، اڑن کھٹولہ، کھٹولی، چھپر کھٹ، کھرا، کھری، جھلنگا، پلنگ، پلنگڑی، ماچ، ماچی، ماچا، چارپائی، نواری، مسہری، منجی۔
کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آجاتی ہیں، اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا، جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکہ اور تانگہ پر	رہا یہ سوال کہ چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا

ان کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔
جو شخص ایسی غزل لکھ سکتا ہے اس کے
سارے قصور معاف کیے جا سکتے ہیں خواہ وہ
غلط اردو ہی لکھتا کیوں نہ ہو۔

ممتاز مفتی

یہ بھیتر کی باتیں ہیں......بات وہ جو بھیتر کی
ہو، گری ہو، چھلکا نہ ہو، جو بجتی ہو، جگ بجتی
نہیں......بھیتر کے نشے سے ڈرو، بوتل کا تو
کام کاج کا نہیں چھوڑتا، بھیتر کا کسی جوگا
نہیں چھوڑتا''

نہیں دیکھا۔
مرنے کے بعد لوگ بڑی سے بڑی غلطی بھی
معاف کر دیتے ہیں حتیٰ کہ زبان کی غلطیاں
بھی۔

مشتاق یوسفی

دھرتی بھیتر ہی بھیتر میٹھی میٹھی آنچ میں تپتی
رہتی ہے۔

عبداللہ حسین

یہ ایسے ہی معمولی آوارہ کتے تھے جو ہر گاؤں
میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا
خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں
کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے
ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے
مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی
کے لیے سخت خطرے کا باعث سمجھتے ہیں،
اپنے خدشات کا اعلان اونچی آواز میں بھونک
بھونک کر کرتے اور اسی طرح مخالفت کا

مشتاق یوسفی

ہر موڑ پر گلی کے کتے چاروں طرف سے
اٹھیں اور اسے گھیر لیتے اور کھدیڑتے
ہوئے دوسری گلی تک لے جاتے، جس کی
بین الکلبی سرحد پر دوسرے تازہ دم کتے
چارج لے لیتے......انھیں آج پہلی دفعہ
معلوم ہوا کہ گاؤں میں اجنبی کی آمد کا
اعلان کتے، مور اور بچے کرتے ہیں، اس
کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا
مہمان بن جاتا ہے۔

اظہار کرتے ہوئے اگلے گاؤں تک تعاقب
جاری رکھتے، جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی
معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر
کے باطمینان سے واپس لوٹتے۔"

محمود نظامی

ایک مرتبہ پھر میں کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے
کے ساتھ سر جوڑ کر باہر کی دنیا کا نظارہ
کرنے لگا۔ آسمان کی گہری نیلی چادر پر
ٹکے ہوئے روپہلی اور نقرئی تارے جھلمل
جھلمل کر رہے تھے اور دور چاند کا طلائی
سفینہ دھیرے دھیرے مغرب کی سنہری
دھار کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش میں
مصروف تھا۔

مشتاق یوسفی

اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے
پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی
ہے۔ گرد آلود بادلوں کے پیچھے شرارت
سے روشن آنکھیں...... بیری سے ہولے
ہولے اپنی کینچلیاں اتارتا چلا جاتا ہے اور
ننگے پاؤں، تتلیوں کے پیچھے دوڑنا، رنگ
بہ رنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ،
پریوں اور آگ اگلتے اژدہوں کو بنتے بگڑتے
دیکھتا......کھڑا رہ جاتا ہوں۔[۶۵]

ڈاکٹر محمد صادق کے سرقے:

آزاد کے بارے میں بیسیوں اطلاعات فراہم کرنے کا دعویٰ بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ اس مضحکہ خیز دعوے کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون ''آزاد معاصرین کی نظر میں'' لاہور کے رسالے سویرا میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ''نظم اردو'' کے شاعروں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ مجھے اس مضمون کے مطالعے میں جابجا یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا طرز بیان نہیں۔ کوئی حوالہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ خیال ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی تحقیق کیسے ہوسکتی ہے۔ جگہ جگہ انداز بیان مختلف تھا۔ غور کرتا رہا، شہادتیں تلاش

کرتا رہا، آخر کار سراغ مل گیا، یہ ساری تفصیل ''مقالاتِ گارساں دتا سی'' سے ماخوذ تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سہواً یا عمداً حوالے سے گریز کیا۔ غالباً وہ ''ممنونیت کی گراں باری'' کا اظہار نہیں چاہتے تھے۔ میں نے جب نظم اردو کے شاعروں کی تفصیل قلم بند کی تو ڈاکٹر صاحب کے بیانات کے ساتھ ساتھ مقالات گارساں دتا سی سے بھی استفادہ کیا اور دونوں کا حوالہ دیا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو اپنی کتاب آبِ حیات کی حمایت میں ...... شامل کیا۔ مضمون کو کتاب میں شامل کرنے کے لیے انھیں دتا سی کے تمام حوالے قلم بند کرنا پڑے، کیوں کہ میں انھیں اپنی کتاب میں واضح کر چکا تھا۔[۶۶]

سرقے یا تسامحات:

ڈاکٹر صادق کے سرقے کو سرقہ کہنے کے بجائے ڈاکٹر اسلم فرخی صوفیانہ لہجے میں اسے تسامحات کہتے ہیں اور دوسرے سرقے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تسامحات کی یہ روداد اتنی طویل ہے کہ ان کو ترتیب دے کر ایک پوری کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ میں نے صرف چند ہی پر اکتفا کیا ہے۔ بہ سبیلِ تذکرہ ایک لطیفہ بیان کرنا بھی ضروری ہے:

ڈاکٹر محمد صادق کے انگریزی مقالے کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے آزاد کی تاریخ پیدائش ۱۵/ ذی الحجہ مطابق ۱۲/ جون ۱۸۳۰ء لکھی ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں اس کی تردید کی اور تحقیق کے بعد ۱۸/ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ مطابق دس جون ۱۸۳۰ء کو صحیح تاریخِ ولادت قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ انگریزی مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا تو میری پیروی میں آزاد کی تاریخِ ولادت ۱۰/ جون ۱۸۳۰ء قرار دی، لیکن اس تصحیح میں میرا کوئی حوالہ نہیں دیا، تا کہ وہ ''ممنونیت کی گراں باری سے محفوظ رہیں''۔[۶۷]

ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کا بہتان:

ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی دو کتابوں ''آبِ حیات کی حمایت میں'' اور ''محمد حسین آزاد احوال و آثار میں'' ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے بہتان باندھے ہیں۔

۱۔ تدوینِ دیوانِ ذوق'' اور ''سخن دانِ فارس پر مزید روشنی'' کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو باقی مضامین کا معتد بہ حصہ آپ کو محمد حسین آزاد مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی میں مل جائے گا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی تالیف نیرنگِ خیال میں اپنی انتخاب کردہ مثالیں دے کر اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ یہ معلومات انھیں کہاں سے دستیاب ہوئیں۔ [۶۸]

۲۔ ''علم اور معلومات کی اشاعت ایک قابلِ تعریف کام ہے اور اس میں بخل سے کام لینا تنگ نظری کے مترادف، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ رسمی آداب سے کام لیا جائے اور مستعار معلومات کا اعتراف کیا جائے۔ [ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے] اس بات پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی اطلاعات کا، جن کا علم یا مواد ہمارے سوا اور کسی کو نہیں، استفادے کا اعتراف کیا ہے، لیکن بیسیوں ایسی اطلاعات کا، جو ہم نے ایسی تصانیف سے انتخاب کی ہیں، جو دستیاب ہیں ہمارا حوالہ دیے بغیر اصل تصنیف کا حوالہ دے دیا ہے۔ غالباً اس سے وہ ممنونیت کی اس گراں باری سے، جو ان پر عائد ہوتی ہے، کسی حد تک سبک دوش ہونا چاہتے ہیں''۔[۶۹]

ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے الزام کی حقیقت:

ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی پہلی کتاب ۷۳ اور دوسری کتاب ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے بے بنیاد الزامات عائد کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس وقت خاموشی اختیار کی مگر اب اٹھائیس سال کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے تو شرافت اور روحانیت کے پھول بکھیر دیئے ہیں، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صادق کے بہتان پر فرخی صاحب نے شریفانہ سکوت اختیار کیا۔ ۲۸ برس بعد اکرام چغتائی کے جواب میں وہ اس طویل خاموشی سے

پردہ اٹھاتے ہیں اور ہمیں تہذیب شائستگی اور سلیقے کی رسم قدیم سے آگاہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

''میرے قارئین مجھ سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کی تنقید کا جواب کیوں نہیں لکھا؟ ان کی پہلی کتاب ۱۹۷۴ء اور دوسری ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ستائیں برس کے بعد جواب اور اس رد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں اور احباب نے مجھے جواب اور رد لکھنے کی بڑی تاکید کی۔بعض بزرگ جواب نہ لکھنے پر مجھ سے سرگراں بھی رہے، لیکن میں نے کوئی جواب نہیں لکھا، کیوں کہ ۱۹۷۴ء سے پہلے ہی میں ایک ایسے روحانی سفر کا آغاز کر چکا تھا، جس میں جواب اور رد اور چشم بخشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔پیرومرشد حضرات استاذی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب قبلہ نے بھی منع فرمایا کہ جواب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔دیدۂ بینا کے حامل افراد اور صاحبانِ بصیرت خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تمہارا کام کس نوعیت اور قدر و قیمت کا ہے۔

اکرام چغتائی صاحب کا مضمون پڑھ کر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں حسب سابق اس کا کوئی جواب نہیں لکھوں گا، لیکن اس دفعہ میرے بعض تلامذہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر آپ جواب نہیں لکھیں گے تو ہم خود جواب لکھ دیں گے۔میرا تعلق باب نبرد سے نہیں ہے، لہٰذا میں دھمکی میں آ گیا اور پیرومرشد حضرت استاذی کی اجازت سے، مجبوراً یہ جواب قلم بند کیا۔مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے جواب نہیں لکھا تو میرے تلامذہ جذبات کی رو میں بہ کر نجانے کیا لکھ دیں۔کہیں کہیں میرا لہجہ تیز بھی ہو گیا، کیوں کہ ''قلندر ہر چہ گوید فاش گوید''۔تاہم میں ڈاکٹر محمد صادق صاحب کی روح سے شرمندہ ہوں، معذرت خواہ ہوں۔اکرام چغتائی صاحب ملک کے نامور کتابیات ساز اور محقق ہیں۔میرے اس جواب سے وہ ضرور آزردہ ہوں گے میں ان سے بھی معذرت خواہ ہوں۔[۷۰]

ناموں کا سرقہ:

کتابوں کے ناموں کے سرقے کی روایت بھی اردو میں بہت مستحکم ہے۔ آج کل عموماً مولفین وسیع المطالعہ نہیں ہوتے لہٰذا انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس نام کی کتاب پہلے شائع ہو چکی ہے۔ بعض مصنفین دانستہ پرانے نام رکھ لیتے ہیں، انگریزی خواں مصنفین ناموں کا ترجمہ کر لیتے ہیں یہ بھی سرقے کی ایک شکل ہے مثلاً ''سرگزشت الفاظ'' احمد دین صاحب کی کتاب پادری ٹرینچ کی انگریزی کتاب Study of Words سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے انگریزی نام کا خوبصورت ترجمہ ''سرگزشت الفاظ'' کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس امر کی وضاحت ابتدا ہی میں کر دی ہے کہ یہ کتاب دراصل انگریزی کی ایک کتاب کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ لیکن انگریزی کتاب کا نام نہیں بتایا گیا۔ اصل کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں اور احمد دین صاحب نے ان کی جگہ اردو، فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کو لے لیا ہے۔[۱۷]

روزنامہ جسارت کے ادبی صفحات پر ۱۹۸۸ء میں ایک مضمون ''کتابوں کے ناموں میں سرقہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں کتابوں کی فہرست بھی شائع ہوئی تھی لیکن اس کا تراشہ ہمیں کوشش کے باوجود نہیں مل سکا۔

سرقوں کے خلاف مہر نیم روز کا جہادِ اکبر:

۱۹۵۶ء میں خانوادہ شاہ سلیمان پھلواری کے فرزندوں حسن مثنّیٰ ندوی اور علی اکبر قاصد نے کراچی سے مہر نیم روز نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مجلس ادارت میں تین سید حسن مثنّیٰ ندوی، علی اکبر قاصد اور سید ابوالخیر کشفی شامل تھے۔ اس رسالے کی اشاعت کا پس منظر حسن مثنّیٰ ندوی کے الفاظ میں یہ تھا:

علی اکبر قاصد انگریزی کے بہت اچھے ادیب اور نقاد تھے۔ غالب کی آواز ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی:

"بی خبران" را خبری بازده
زان می دیرینہ قدری بازدہ

ترجمہ: بے خبروں کوایک "خبر" پھر پہنچاؤ تا کہ اپنی مے دیرینہ کی قدرومنزلت ان کے دلوں میں پھر تازہ ہو۔

اثر پردۂ سازت چہ شد
زمزمہ خارا گدازت چہ شد

ترجمہ: ان سے پوچھو کہ تمہارے ساز کے پردوں سے جو نغمہ ابھرتا تھا اس کا اثر آج کہاں ہے وہ زمزمہ جو پتھر کو بھی گھلا دیتا تھا آخر کیا ہوا۔

در ہوس جاہ فرو رفتہ
حیف کہ در چاہ فرو رفتہ

ترجمہ: تم ہوس جاہ میں ڈوب گئے افسوس تم کنویں کے اندر جا پڑے؟

بندۂ زر بودن از اہریمنی است
مرد خدا این چہ خدا دشمنی است

ترجمہ: بندۂ زر ہو جانا اہرمن پرستی کی دلیل ہے" "مرد خدا" یہ تو یزداں پرستی نہیں سراسر خدا دشمنی ہے۔

یہ آواز مسلسل ہمارے نہاں خانے میں گونج رہی تھی۔ ہم لوگ بالعموم فکر ونظر کو قتل ہوتے دیکھ کر شدید اذیت میں مبتلا تھے۔ قاصد نے کہا آیئے ایک رسالہ نکالیں "مہر نیمروز"۔ میں نے کہا کہ مشکل نام ہے، انھوں نے کہا "دنیا میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے" ہم دونوں نے سید ابوالخیر کشفی کو ساتھ لیا، ادارت میں ہم تینوں کے نام داخل ہوئے۔ ۱۹۵۶ء کی فروری سے اس رسالے کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہ غالب کی وفات کا مہینہ تھا اور رسالے کا نام بھی غالب ہی سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہ علمی وادبی رسالہ تھا۔ علم اور ادب ہی بنیادی چیز ہے جو

آدمی کو آدمی بناتی ہے۔غالب کی آواز طرح طرح سے گونج رہی تھی:

ترا ای بی خبر کاریست درپیش

بیابانی و کہساریست درپیش

تن آسانی بہ تاراج بلا دہ

چو بینی رنج خود را رونما دہ

ہوس را سر بہ بالین فنا نہ

نفس را از دل آتش زیر پا نہ

دل از تاب بلا بگداز و خون کن

ز دانش کار نکشاید جنون کن

شرر آسا، فنا آمادہ، برخیز

بیفشان دامن و آزادہ برخیز

ز الاّ دم زن و تسلیم لا شو

بگو اللّٰہ و برق ما سوا شو

ترجمہ: اے بے خبر! تمہارے سامنے ایک [بڑا] کام پڑا ہے، ایک بیاباں ہے اور ایک کہسار ہے جس کو طے کرنا ہے۔

تن آسانی کو آزمائش وابتلا کے ہاتھوں برباد ہونے کے لیے چھوڑ دو اور اگر تکلیف محسوس ہو تو خود آگے بڑھ جا۔

ہوس کے لیے ایسا کچھ کرو کہ کسی کا سر فنا کے بالین پر دھرا ہوا ہو اور تمہاری ہر سانس کے قدموں کے نیچے ایک آگ دہک رہی ہو۔

اپنے دل کو آمائش وابتلا کی آنچ پر خوب گلاؤ اور پگھلاؤ اور خون گرم میں تحلیل کرو کہ اب دانش مندی کے ہاتھوں کسی کام واقدام کی راہ کھلنے کی نہیں، جنون اختیار کرنا ہے،

وہی راستہ کھولے گا۔

چنگاری کی طرح، فنا ہو جانے کا عزم لے کر اٹھو، اپنے دامن کو جھاڑو اور آزادی کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔

نعرہ ماروا الا کا اور اپنے آپ کو لا کے سپرد کر دو، نام لو اللہ کا اور ما سوا کے حق میں برق ہو جاؤ اور اس پر بجلی بن کے ٹوٹ پڑو۔

کیا گونج تھی، اس کو تو سننے والوں اور محسوس کرنے والوں کے دل سے پوچھئے۔

رسالہ نکلا اور بڑی شان سے نکلا۔ ادارے نے اس رسالے کو عام کرنے کے لیے اپنی جانب سے سخاوت تک کے اقدامات کیے، پورے برعظیم میں اس کو پہنچایا۔ بھارت میں اور اپنے پاکستان کے دونوں حصوں میں۔ اعزازی کاپیاں بھی بہت سے ادیبوں کی خدمت میں ارسال کیں، لیکن کم ہی لوگ تھے جن کو قلمی امداد کا خیال آیا اور جن کو آیا ان میں سے بعض ممتاز صاحبان اخلاص کی خدمت میں ''نجی طور پر'' بغیر کسی اعلان کے ادارے نے کچھ پیش بھی کیا۔ ان میں سے مرحوم ممتاز مفتی اور مرحوم ڈاکٹر ابو اللیث کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ اس رسالے کی طرف لپکتے سب تھے، اس میں مضامین ایسے شائع ہوتے تھے۔ علمی و ادبی اور فکری راستہ دکھانے والے اور زندگی کے نکتے یاد دلانے والے۔ یہ رسالہ بھی شیخ عبدالقادر کے مخزن لاہور اور علامہ سید سلیمان ندوی کے معارف اعظم گڑھ کی طرح دور جدید میں ایک ''مشن'' کا حامل تھا۔ لیکن مشن کے حامل رسالے اور اخبارات کی راہ میں بھی دشواریاں بہت حائل ہو جاتی ہیں، دوسرے ہی سال سے ''مہر نیم روز'' کی راہ میں رکاوٹیں مختلف انداز کی پیدا ہونے لگیں، تاہم یہ رسالہ کبھی رکتا اور کبھی جاری ہوتا رہا، مہر نیم روز اس کا نام تھا اس لیے یوں کہیے کہ ڈوبتا بھی رہا اور ابھرتا بھی رہا۔ سید علی اکبر قاصد کو امداد باہمی کے طوفانی کاموں نے دل کی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ میں اسکندر مرزا کے قائم کیے ہوئے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں یہ جاننے کے لیے داخل ہو گیا کہ یہ

کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ ورنہ میں تو نیشنل کالج میں پڑھاتا تھا اور کبھی ریڈیو پر چہکتا تھا، سید ابو الخیر کشفی کراچی یونیورسٹی میں داخل ہو گئے، ۱۹۶۲ء کا چوتھا مہینہ تھا سید علی اکبر قاصد کے دل نے خاموش ہو جانے کی ٹھانی، آخر ڈوب گیا:

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے محبوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

تو میں سب کچھ بھول گیا اور انسٹی ٹیوٹ سے نکل کے گھر کی جانب متوجہ ہو گیا لیکن کسی کام میں جی لگتا نہ تھا۔[۴۷]

مہر نیم روز کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۵۶ء کو منظر عام پر آیا اور ادبی سراغ رساں کے نام سے ''چہ دلاور است'' کے عنوان سے علمی، ادبی و تحقیقی سرقوں کا مستقل سلسلہ شروع ہوا۔

مہر نیم روز کے ادبی سراغ رساں:

یہ ادبی سلسلہ ادبی سراغ رساں کے قلمی نام سے دو سال تک مسلسل جاری رہا۔ سراغ رسانوں کی فہرست میں حسن مثنّی ندوی، ابو الخیر کشفی، علی اکبر قاصد، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نظیر صدیقی، قاضی عبدالودود وغیرہ شامل تھے۔

مہر نیم روز کے مضامین کی تفصیلات:

ذیل میں ''مہر نیم روز'' میں چہ دلاور است'' کے عنوان سے علمی، ادبی، تحقیقی سرقوں کی سرگزشت کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ کل اکتیس مضامین تحریر کیے گئے، ۲۴ مضامین شائع ہوئے جب کہ سات مضامین غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک مضمون جو دانتے کے سرقے کا احاطہ کرتا ہے حبیب الحق ندوی صاحب نے تحریر کیا تھا یہ کسی اور رسالے میں شائع ہوا بعد ازاں کاروان ادب لکھنؤ میں بھی شائع ہوا۔

یہ مضامین اپریل ۱۹۵۶ء تا ستمبر ۱۹۵۸ء تک مسلسل شائع ہوئے، کچھ وقفے کے بعد مارچ ۱۹۶۰ء میں دو مضامین شائع ہوئے پھر ایک طویل وقفے کے بعد آخری مضمون ۱۹۷۰ء

میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں مہر نیم روز ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ مطبوعہ مضامین کی ترتیب زمانی درج ذیل ہے:

مرزا حیرت	ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
تاریخ امت	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
ترجمان القرآن	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
انڈین فلاسفی	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
اعجاز المسیح	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
علامی ابوالفضل	سید ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
مرزا حیرت	سید ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
اطالوی بیداری	ڈاکٹر حبیب الحق ندوی	غیر مطبوعہ
ترغیبات جنسی	سید حسن مثنی ندوی	جون ۱۹۵۶ء
سیر المصنفین	سید حسن مثنی ندوی	جولائی ۱۹۵۶ء
نیلی چھتری	سید حسن مثنی ندوی	اکتوبر ۱۹۵۶ء
اس نے کہا	سید حسن مثنی ندوی	نومبر ۱۹۵۶ء
عالم گم گشتہ	سید حسن مثنی ندوی	دسمبر ۱۹۵۶ء
فانی بدایونی	سید حسن مثنی ندوی	جنوری ۱۹۵۷ء
نظامِ اقتصادیات	سید حسن مثنی ندوی	مارچ ۱۹۵۷ء
اردو	سید حسن مثنی ندوی	مئی ۱۹۵۷ء
نقادانِ کرام	سید حسن مثنی ندوی	اکتوبر ۱۹۵۷ء
ضدی	سید علی اکبر قاصد	مارچ ۱۹۵۶ء
ن،میم راشد	سید علی اکبر قاصد	اپریل ۱۹۵۶ء

چھر	سید ابوالخیر کشفی	فروری ۱۹۵۶ء
نیرنگِ خیال	سید ابوالخیر کشفی	اگست ۱۹۵۶ء
احتساب کانفرنس	رسالہ الناظر لکھنؤ	مئی ۱۹۵۶ء
تصورِ اقبال	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	جولائی، اگست ۱۹۵۷ء
نرگس جمال	نظیر صدیقی	جون ۱۹۵۷ء
مزدور کی بیٹی	رسالہ زمانہ کانپور	اپریل ۱۹۵۷ء
شہزادہ اور عورت	سید ابوالخیر کشفی	اپریل ۱۹۵۸ء
فارابی	پروفیسر حافظ غلام مرتضیٰ	ستمبر ۱۹۵۸ء
مثنوی	قاضی عبدالودود بیرسٹر	جون، جولائی ۱۹۵۸ء
چراغ تلے اندھیرا	سلیم عاصمی	جنوری سالنامہ ۱۹۵۸ء
اصولِ تمدن	سید ابوالخیر کشفی	اپریل ۱۹۵۹ء
یدِ بیضا	مولانا احسن مارہروی	ستمبر ۱۹۶۰ء

مولانا حسن مثنّٰی ندوی مرحوم کے مسودات سے سرقہ بازوں کی ایک فہرست بھی برآمد ہوئی ہے۔ اس فہرست کی تفصیل ابوالانشاء کے قلم سے پڑھیے: ان موضوعات پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نشانات راہ مولانا نے بتادیے ہیں۔

شاپنہاور	شوپنہاور کی جہاں تک زندگی اور فلسفے کا تعلق ہے، مجنوں گورکھپوری کی کتاب تمام تر ٹامس وٹیکر کی تلخیص وترجمہ ہے۔ ابواب وعنوانات بھی انھوں نے اسی سے اخذ کیے ہیں۔
صحابیات:	نیاز فتح پوری نے لکھی ہے اور دارالمصنفین کی کتاب سیر الصحابیات ان کا ماخذ ہی نہیں حاصل ہے۔
فتنۂ تاتار:	ایم اسلم کی مشہور کتاب ہے مگر اس ناول نگار نے دوسرے

مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر کی کتاب زوالِ بغداد کو اپنا حاصل بنا لیا ہے۔

آغازِ ہستی: مجنوں گورکھپوری کی کتاب ہے مگر کہتے ہیں کہ برنارڈ شا کی کتاب Back to Methnila ان کے سامنے تھی۔

مصرف رقاصہ: پطرس بخاری کی کتاب ہے، میری کوریلی ان کے سامنے تھی۔

طلسمات: عبدالحلیم شرر کی کتاب ہے اور ملک العزیز ورجینا بھی، رام بابو سکسینہ کا بیان ہے کہ اسکاٹ کی تصنیف ان کے سامنے تھی۔

خوابِ ہستی: مرزا محمد سعید کی کتاب ہے۔ چارلس ریڈ کا چربہ ہے۔

الحمراء کی کہانیاں: غلام عباس نے لکھیں، واشنگٹن ارونگ کی انگریزی کتاب اسی نام سے ہے الحمراء کی کہانیاں۔

کرنیں، شگوفے حماقتیں: شفیق الرحمٰن ...... لیکاک، [Library Lappes]

پچھتاوے: شفیق الرحمٰن ...... ڈیمن ریناں [Good solder shewich]

سلیم اللہ خاں [افسانہ]: منٹو ...... سمرسٹ ماہم

اس منجدھار میں [ڈرامہ]: منٹو ...... سمرسٹ ماہم

جاڑے، سردی گرمی [افسانہ]: فرحت اللہ بیگ ...... Destrninter series 5th

مرزا مینڈک [افسانہ]: ایم اسلم ...... مارک ٹوئین [Jumping frog]

نرگس: ایم اسلم ...... لیگوینڈ رڈوماز، [Lady with the canalions]

رات [افسانہ]: اے حمید موپاساں [Night]

مثلث[افسانہ]: عزیز احمد......ڈمر چارلس

کلیاں[افسانہ]: عزیز احمد......ڈمر چارلس

ابھوش: پریم چند......ایوام آڈن

گنا: مجنوں گورکھپوری...... ٹینی سن اور ٹامس ہارڈی[Tess]

ترقی پسند ادب: عزیز احمد......ڈیوڈ گوما[Croche]

تاریخ الدولتین: نیاز فتح پوری......جرجی زیدان، التمدن الاسلامی۔

دلیر مجرم: ابن صفی ......پٹیر سنی [The centre design]

نیلی سوئی: مظہر انصاری......پٹیرسنی [The centre design]

پہاڑوں کی ملکہ: ابن صفی ......سرایچ رائیڈ رہیگرڈ

خونی دیوتا: ابن صفی ......سرایچ رائیڈ رہیگرڈ

انور: ابن صفی ......لیلی چارٹرس 'دی سائمن ٹمپلر] [۴۷]

مہر نیم روزا ور حسن مثنیٰ نے سرقہ نویسی اور سرقہ بازوں کے سلسلے میں جہاد اکبر کیا۔

شبیر میواتی: مشفق خواجہ: عابد مسعود کی معلومات سرقہ

لاہور کے نامور اہل علم شبیر میواتی صاحب نے سرقہ کے سلسلے میں بعض نادر اور اہم معلومات مشہور مفکرین کے حوالے سے مہیا کی ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ خود اس معلومات کی ادارت فرما کر شائع کریں۔حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی وہ بیاض جس میں غالب اور بیدل کے اشعار آمنے سامنے ہیں سرقہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔یہ بیاض ڈاکٹر تحسین فراقی کے سپرد کی جارہی ہے تاکہ وہ مقالہ تحریر فرمائیں۔ جناب مشفق خواجہ مرحوم نے عصر حاضر کے سرقوں پر بعض اہم معلومات مہیا فرمائی ہیں جو کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی۔ چیچہ وطنی سے عابد مسعود صاحب نے مولانا مودودیؒ کی الجہاد فی الاسلام کے کئی صفحات کو مولانا آزاد کا سرقہ قرار دیا ہے لیکن ابھی تک وہ اس کے ٹھوس شواہد مہیا نہیں کر سکے۔غلام احمد پرویز صاحب

نے اپنی تفسیر کے بہت سے مقامات مولوی چراغ علی سے سرقہ کیے ہیں اور بہت سے افکار و نظریات کا سرقہ سرسید، احمد دین امرتسری اور حضرت علامہ اقبالؒ سے کیا ہے، لیکن اس کا اعتراف کہیں نہیں کیا گیا۔ لغات القرآن کی تالیف، تدوین و ترتیب میں علامہ تمنا عمادی، جعفر شاہ پھلواریؒ اور عمر احمد عثمانی کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن پرویز صاحب نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ پھلواری صاحب کو تو معاوضت رقم ادا کر دی گئی تھی، لیکن عمادی اور عثمانی صاحب کو تو معاوضہ بھی ادا نہیں کیا گیا۔

سرقے کی ایک عجیب و غریب قسم:

بعض محققین کا خیال ہے کہ ''ڈاکٹر فاروق خان صدر دانش سرا پاکستان کی تمام کتابیں جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار، تقاریر، خیالات کا لفظ بہ لفظ سرقہ ہیں۔ وہ اسے استفادہ کا نام دے کر معصومانہ اعتراف فرماتے ہیں، کئی کتابوں میں یہ اعتراف بھی موجود نہیں ہے۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر جاوید غامدی صاحب کی بہت سی کتب ڈاکٹر فاروق کا سرقہ قرار پائیں گی۔ مثلاً اصول و مبادی اور اسلام کیا ہے مولفہ ڈاکٹر فاروق کے تمام مباحث لفظ بہ لفظ اور معناً بھی ایک جیسے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق خاں کی تمام [۱] کتب اسلام اور عورت، [۲] جہاد و قتال اور عالم اسلام [۳] اسلام کیا ہے؟ [۴] جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب [۵] مرد اور عورت سماجی تعلق کے آداب [۶] حدود و آرڈیننس اور خواتین جاوید غامدی صاحب کی تین سو تقاریر اور سوال و جوابات کا مکمل سرقہ ہیں۔'' ہماری تحقیق کے مطابق اسے سرقہ کہنا زیادتی ہے۔ ڈاکٹر فاروق دانش سرا کے صدر ہیں اور یہ کتابیں اپنے مسلک کی تبلیغ کے لیے مسلک کے بانی کی اجازت، رہنمائی، مشاورت اور سرپرستی سے تیار کی گئی ہیں۔ یہ سرقے کی وہ قسم ہے [اگر اسے سرقہ کہا جا سکے] جو افہام و تفہیم اور باقاعدہ و باضابطہ اجازت سے یا منصوبہ بندی، مصلحت، حکمت اور بعض نزاکتوں کے باعث عمل میں آتی ہے۔ دانش سرا کے سرپرست جناب غامدی صاحب ہیں اور اس کے صدر

جناب ڈاکٹر فاروق لہٰذا اس کو سرقہ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس طرح کے کاموں کے لیے کوئی اصطلاح ابھی تک وجود میں نہیں آئی ۔لہٰذا اسے سرقے کے ذیل میں رکھنا مناسب بات نہیں ۔اس قسم کے معاملات کی مثال ماضی میں بھی ملتی ہے مثلاً اہلحدیث عالم جناب نواب صدیق حسن قنوجی کی بہت سی کتابیں ان کے صاحبزادوں کے نام سے ہیں جب کہ ان مصنفین کی عمریں کتابوں کی تالیف کے وقت دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ڈاکٹر معین الدین عقیل کے تحقیقی مقالات کے مجموعے میں اس موضوع پر تفصیلی معلومات مہیا کی گئی ہیں ۔ اس فعل کو سرقہ کہنا بہت مشکل ہے ۔اس کی تفصیلات کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی کم وبیش یہی معاملہ ڈاکٹر فاروق خان صاحب کی کتابوں کا ہے ۔

جامعات کے تحقیقی مقالے سرقہ کی نئی روایت :

بیسویں صدی کے عظیم ترین سرقے کا ارتکاب اردو ادب کے دو بڑے لوگوں پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر آل احمد سرور کی زیرسرپرستی جامعہ لکھنؤ میں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے کیا ۔یہ بیسویں صدی کا المیہ ہے ۔ایسے المیے پاکستان و ہندوستان کی جامعات میں کثرت سے ہو رہے ہیں ۔جامعہ پشاور نے اس الزام میں ایک استاد کو ملازمت سے برطرف کر دیا تھا ۔جامعات میں سرقوں کا سلسلہ جاری وساری ہے اور تحقیق کا ایک الگ موضوع ہے ۔بیسویں صدی کے سرقوں کی بےشمار اقسام کو اس میں دانستہ شامل نہیں کیا گیا ۔

وقار عظیم اور سجاد باقر رضوی کے سرقے

ممتاز لیاقت کی تحقیقات سرقہ ''بکف چراغ دارد'' کے مطابق پروفیسر سید وقار عظیم نے ''تاریخی ناول اور اس کا فن'' کے نام سے رسالہ سویرا کے ۲۶ ویں شمارے میں ایک سرقہ شدہ مضمون شائع کیا ۔یہ مضمون Alfred Tresidder Sheppard کی کتاب The Art & Praetice of Historical Fiction سے لفظ بہ لفظ سرقہ کیا گیا ہے ۔یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں Humphrey Toulmin نے لندن سے شائع کی تھی اور تاریخی ناول کے فن پر مشہور اور معرکہ

آراء تصنیف ہے۔ وقار عظیم صاحب دانش گاہ پنجاب سے وابستہ تھے۔ جامعہ پنجاب کے دائرہ المعارف اسلامیہ کے لیے وقار عظیم صاحب نے امانت لکھنوی پر مقالہ تحریر فرمایا تو یہ مقالہ بھی حسب سابق سرقہ تھا اور سید مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب "لکھنو کا عوامی اسٹیج [مطبوعہ ۱۹۵۷ء سلیمی پریس الہ آباد] سے لفظ بہ لفظ سرقہ کیا گیا۔ جامعہ پنجاب سے ملحقہ علمی ادارے اورینٹل کالج کے استاد پروفیسر سجاد باقر رضوی نے مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی مجلے "صحیفہ" کے ۳۶ ویں شمارے بابت جولائی ۱۹۶۶ء میں "ہنسی کے متعلق عرب حکماء کے چند نظریات" پر مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ مقالہ Franz Rosenthal کی کتاب Humour in Early Islam سے سرقہ کیا یہ سرقہ کتاب کے ضمیمہ Appendix: on Langhter صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۸ سے چربہ کیا گیا ہے۔ اورینٹل کالج اور دانش گاہ پنجاب کے دو اہم اساتذہ کے سرقوں سے صورت حال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کی سرقہ شدہ کتاب:

جامعات میں سرقوں کی روایت پاکستانی اور ہندوستانی جامعات سے مخصوص نہیں ہے دنیا کی بڑی بڑی جامعات میں بڑے پیمانے پر سرقہ کی وارداتیں ہوتی ہیں جنھیں جامعات کے عزت ووقار کی خاطر دبا دیا اور چھپا دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی کے نسل پرست یہودی پروفیسر ورشووٹز کی کتاب Chutzpah [1992] کے بارے میں Norman Finkelstein نے اپنی کتاب Beyond Chutzpah: on the misue of anti semiticism & abuse of history میں اس سرقے کے بارے میں چونکانے والے انکشافات کیے ہیں۔ نارمن فنکلسٹائن Norman Finkelstein کی کتاب امریکہ میں آج کل توجہ کا مرکز ہے۔ یہ کتاب ہاورڈ یونیورسٹی کے نسل پرست اور اسرائیل کے زبردست حامی قانون کے پروفیسر ورشووٹز کی کتاب Chutzpah [1992] کی جعلسازی اور سرقہ بازی بے نقاب کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ نارمن فنکلسٹائن خود ایک یہودی ہیں، اپنی کتاب میں انھوں

نے اسرائیل کا اصل چہرہ دکھایا ہے ۔نارمن The Holocaust Industry کے مصنف بھی ہیں جس نے پوری یہودی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا ۔وہ De Paul University شکاگو میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں اور اپنی تازہ ترین تصنیف میں انھوں نے ہاورڈ میں قانون کے صیہونی پروفیسر Allan Dershowitz کے علمی بت کو مسمار کردیا ہے ۔ پروفیسر درشووٹز جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی بعض کتابیں صیہونیت، یہودیت اور اسرائیل کی رواں حکمت عملی کی مدلل مداحی کرتی ہیں، ہمیشہ سے فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم کے معذرت خواہانہ حامی رہے ہیں ۔ اپنی کتاب [1992] Chutzpah اور [2003] The Case for Israel میں انھوں نے صیہونیوں کے حق میں جذباتی دلائل بھی دیے ہیں مگر نارمن فنکلسٹائن نے Beyond Chutzpah میں پروفیسر درشووٹز کو دھوکہ باز، جھوٹا اور سارق قرار دیا ہے ۔کتاب The case for Israel کے تعارفی باب میں ہاورڈ کے پروفیسر درشووٹز نے دعویٰ کیا تھا کہ کتاب میں دی گئی معلومات اور حقائق کو دیکھ کر وہ لوگ یقیناً حیران رہ جائیں گے جو ہمیشہ یک طرفہ ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں ۔مگر وہ لوگ جو اسرائیل فلسطین تضاد پر شائع ہونے والی تاریخی تعصبات سے بھرپور Peer کی انگریزی کتاب سے واقف ہیں وہ اس کتاب کے مندرجات سے قطعی حیران نہیں ہوں گے ۔نارمن کی تحقیق کے مطابق اپنی اس کتاب میں درشووٹز نے جان پیٹر کی یادگار تاریخی دھوکا بازی پر مبنی تصنیف From time immemorial کے تمام ماخذات کا چربہ کرلیا ہے ۔نیز اس نے انتہائی بے شرمی سے نہ صرف Peter کے مواد کی ہوبہو نقل کی ہے ۔ بلکہ انھوں نے بہ بانگ دہل اس کتاب سے مواد چوری کیا ہے، اس عمل کی سنجیدہ اہل علم طبقہ [اسکالرز] نے مذمت بھی کی ہے ۔یہ عالمانہ بدنامی ہے یا سرقہ بازی یا دونوں؟ چند سال قبل دونوں پروفیسرز کو ایک ٹی وی شو میں درشووٹز کی کتاب پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا گیا تو فنکلسٹائن نے مصنف پر الزام لگایا کہ مصنف نے ایک بڑا دھوکہ تخلیق کیا ہے ۔ان دونوں کے درمیان ہونے والی تکرار ایک جنگ کی صورت اختیار کرگئی ۔فنکلسٹائن کا کہنا تھا کہ اسے اس دھوکے سے صدمہ پہنچا

ہےاور یہ صدمہ اس لیے شدید ہے کہ یہ ہارورڈ کے ایک پروفیسر کی طرف سے ہے جبکہ قانون کے پروفیسر ورشووٹز نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے اسے فنکلسٹائن کی ذاتی مخاصمت کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اصل مسئلے پر گفتگو کرنے کے بجائے اس کی ذات کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جو حرکت ہاورڈ کے پروفیسر نے کی ہے۔ اسی کا ارتکاب اگر وہاں کا طالب علم کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا؟ فنکلسٹائن نے اپنی کتاب Beyond Chutzpah کے اجراء کے بعد یہ سوال کیا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسے ہارورڈ سے نکال دیا جاتا تو پھر ہارورڈ فنکلسٹائن کے اس قدر رنجیدہ الزامات کے جواب میں کیوں خاموش ہے؟ کیا یہاں طلباء کے لیے ایک قانون اور پروفیسرز کے لیے دوسرا قانون ہے؟ ایسا سوچا جا سکتا ہے کیونکہ ہارورڈ یونیورسٹی کے موجودہ صدر Lawrence Summers ایک یہودی اور اسرائیل کے حامی ہیں۔ MIT کے مثالی دانش ورنوم چومسکی نے فنکلسٹائن کے کام کی تعریف کی ہے اور اسے ٹھوس، اہم اور بہت زیادہ معلومات انگیز کتاب قرار دیا انھوں نے ورشووٹز کو اسٹالن کے انداز کا ٹھگ قرار دیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر علوی شلیم کا کہنا ہے کہ Beyond Chutzpah ایک نہایت عالمانہ کتاب کی اشاعت رکوانے کے لیے ورشووٹز نے ہر طرح کے اقدام کا عندیہ دیا، جب یہودی قوت ہر اس شخص کے لیے خطرناک اور مہلک ہے جو اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ورشووٹز نے کیلیفورنیا کے گورنر شوارٹز نجر سے درخواست کی ہے کہ اس کتاب پر پابندی عائد کی جائے جس کے جواب میں گورنر کے قانونی امور کے مشیر نے جواب دیا کہ وہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کا دباؤ استعمال نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ یہ علمی آزادی کا معاملہ ہے۔

نیویارک کی مشہور کتابوں کی دکانیں جہاں تمام مقبول کتابیں دوکان کے سامنے سجائی جاتی ہیں وہاں نارمن فنکلسٹائن کی کتاب سامنے موجود نہیں تھی بلکہ یہ دکان کے پچھلے حصے میں رکھی گئی تھی اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ دکان کے مالکان یہودیوں کے خلاف کوئی بھی مواد سامنے نہیں رکھنا چاہتے اس سے فوراً یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس کے علاوہ اور کیا کیا چیزیں چھپائی گئی

ہوں گی؟

بیسویں صدی سرقوں کی نئی اقسام کی صدی:

بیسویں صدی میں سرقوں کے ان گنت اقسام ایجاد کی گئیں مثلاً محققین کے مسودات چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرالینا، دوسروں محققین کی عسرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اونے پونے داموں پر مسودات خرید لینا، عقیدت مند کی طرح حاضر خدمت ہو کر کسی موضوع کو چھیڑنا اور گفتگو کے دوران بکھرنے والے لولوئے لالہ کو سمیٹ کر مقالے تیار کرنا، کسی گوشہ نشین اہل علم سے استفادہ کرتے ہوئے گفتگو ریکارڈ کر لینا یا ان کی مجالس کو محفوظ کر کے اپنے نام سے کتاب تیار کرنا اور کتاب ان کے نام معنون کر دینا۔ جناب ضمیر نیازی نے ایم کے ایک ایسے ہی مقالے کا ذکر کیا تھا جو ایک جامعہ کے مرکز مطالعات پاکستان کی طالبہ نے ضمیر نیازی کی کتاب صحافت پابند سلاسل سے حرف بہ حرف سرقہ کیا اور اس کا انتساب ضمیر نیازی کے نام کر دیا اور یہ کتاب اسی مرکز سے شائع بھی ہوگئی۔ مختلف ناشرین اور اداروں کے پاس طباعت کے لیے آنے والے مسودوں کا مطالعہ کر کے اسی موضوع پر کتاب اصل کتاب کی طباعت سے پہلے شائع کرا لینا، طلباء و طالبات سے تحقیق کرا کے اپنے نام سے مقالات اور کتابیں شائع کرانا، قینچی کے ذریعے تحقیق کر کے کتابیں اور مضامین تیار کرنا، کتاب کے شروع میں لکھ دینا کہ کتاب لکھتے ہوئے یہ اہم کتابیں پیش نظر رہیں اور ان اہم کتابوں کے مضامین و دلائل لفظ بہ لفظ نقل کر لینا، اس کے علاوہ انٹرنیٹ سے سرقے کے جدید ترین طریقے جن کی تاریخ تحریر کرنے کے لیے الگ مقالے کی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کی ایک نئی بدعت اہل علم کے مسودے طباعت سے پہلے چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرانے کی ہے، یہ نہایت خطرناک روایت ہے۔ اس کام میں اردو ادب کے بعض عالی مرتبت لوگ بھی شریک رہے ہیں جن کا ذکر ایک مستقل مقالے کا طلب گار ہے۔ یہ تمام موضوعات ایک علیحدہ کتاب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کام جاری ہے۔

کتابیات

۱۔ مولوی حکیم نجم الغنی بحرالفصاحت،مطبوعہ نول کشور لکھنو،[طبع سوم ۱۹۲۶ء]

۲۔ رسالہ الناظر لکھنؤ مئی ۱۹۱۹ء،بحوالہ مہر نیم روز،مئی ۱۹۵۶ء

۳۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ وتوارد''مشمولہ ماہنامہ زمانہ کانپور،۱۹۳۱ء،جلد ۵۶ نمبر ۳

۴۔ یاس یگانہ چنگیزی غالب شکن مطبوعہ آگرہ،[اشاعت اول ۱۹۳۴ء]

۵۔ پنڈت برج موہن کیفی،منشورات،[دانش محل ترکمن گیٹ دہلی][طبع ثالث ۱۹۴۵ء]

۶۔ عندلیب شادانی سرقہ اور توارد مشمولہ ''تحقیق کی روشنی میں'' شیخ غلام علی لاہور[طبع اول ۱۹۶۳ء]

۷۔ سرقہ یعنی چوری مشمولہ ''دورحاضر اور اردو غزل گوئی''،ایضاً،[طبع اول ۱۹۵۱ء]

۸۔ بکف چراغ دارد،سرقے پر ممتاز لیاقت کے مضامین ہفت روزہ چٹان میں شائع ہوئے تھے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے لیکن کتاب نہیں مل سکی۔

۹۔ ناطق لکھنوی سرقہ وتوارد،ص ۱۵۳،ایضاً

۱۰۔ پنڈت برج موہن کیفی ''نظر اور خوش نظری''مشمولہ منشورات،ایضاً، ص ۱۷۳

۱۱۔ عندلیب شادانی سرقہ اور توارد،ص ۱۷۱ ایضاً،

۱۲۔ ایضاً،ص ۱۷۳

۱۳۔ فراق گورکھپوری،بحوالہ سرقہ یا چوری مشمولہ دورحاضر اور اردو غزل گوئی،ص ۲۶۲

۱۴۔ عندلیب شادانی سرقہ یا توارد، ص ۴۷۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷۲۔

۱۶۔ مآثر الکرام صفحہ ۶۹ حیدرآباد ایڈیشن بحوالہ ''تحقیق کی روشنی میں''، ص ۴۶۹

۱۷۔ شادانیؔ نے مطول کا حوالہ دے کر نجم کے اشعار، بحرالفصاحت کے ص ۱۲۲۲ سے نقل کیے ہیں لیکن ان کا حوالہ نہیں دیا۔ ''سرقہ یا توارد'' پر جتنے بھی اہم مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا ماخذ ''بحرالفصاحت'' ہے۔ امثال بھی اسی کتاب سے لی گئی ہیں لیکن حوالہ ندارد۔

۱۸۔ عندلیب شادانی سرقہ یا توارد، ص ۴۷۱، ۴۷۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۲ تا ۵۰۳، [ایضاً]

۲۰۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ و توارد'' مشمولہ زمانہ کانپور، ص ۱۵۹ تا ۱۵۸، [ایضاً]

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۲۲۔ عندلیب شادانی سرقہ و توارد، ص ۴۷۱، ایضاً

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۷۲،

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ حکیم نجم الغنی بحرالفصاحت، ص ۱۱۷۴، مطبع نول کشور لکھنؤ، [۱۹۲۶ء طبع سوم]

۲۷۔ نعیک نجم الغنی بحرالفصاحت، ص ۱۲۲۶ تا ۱۱۷۴ [سرقے کی قسمیں] ایضاً

۲۸۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ و توارد''، ص ۱۵۹، ایضاً

۲۹۔ خودکشی سے متعلق یہ مضمون مشتاق یوسفی نے کسی کتاب میں بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے لیکن اس کا حوالہ سردست دستیاب نہیں۔

۳۰۔ ناطق لکھنوی سرقہ و توارد، ایضاً، ص ۱۶۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔۱۶۵

۳۲۔ عندلیب شادانی ''سرقہ اور چوری''، ص ۲۹۶، ایضاً

۳۳۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ و توارد'' زمانہ کانپور، ایضاً، ص ۵۹

۳۴۔ عندلیب شادانی ''سرقہ یعنی چوری''، ص ۲۲۵، ایضاً

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۶۵ تا ۲۷۲، ایضاً

۳۶۔ عندلیب شادانی ''سرقہ یا توارد'' مشمولہ تحقیق کی روشنی میں، ص ۲۵۰ تا ۲۷۴

۳۷۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ و توارد'' ایضاً، ص ۱۶۴ تا ۱۶۱

۳۸۔ حسرت موہانی ''نکاتِ سخن'' [غضنفر اکادمی کراچی] [بار اول ۱۹۹۶ء]

۳۹۔ منیر لکھنوی ''منیر البیان تحقیق للسان''، ص ۹۷ تا ۹۹ مطبع مجیدی کانپور [بار اول جنوری ۱۹۳۰ء] منیر لکھنوی نے فارسی شعروں کے اردو سرقوں کی نشاندہی کی ہے ان کا عکس دیا جا رہا ہے۔

اشعار فارسی	اشعار اردو
اشرف ؎ در چشم و دلم مدام بودی آموختی از کہ این ادا را	میر ؎ آنکھوں میں پھر رہو دلے نہیں گھر حیران ہوں شوخی یہ کہاں سے سیکھانے
ناصر علی ؎ برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش	[illegible] ؎ پہنچو ادھری گھونگھٹ کر باغ میں جات حسن باس ہن پچھانے نا نہ سماحت

عہ باغ میں گھونگھٹ نکالے کیلئے جاتی ہو کہ پھول کی خوشبو ۔ بغیر چھنے نہیں پہچانی جاتی ہے منہ

اشعار فارسی	اشعار اردو
میر معزی سہ ہمگوئی کرا تو اتحاد نیست گر غلام کرا را اعتبار نیست	میر سہ کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
ناصر علی سہ دست خواہم زد بدامان سکندر روز حشر شوخی لیلی ز دارہ امر یار ننگ مجنون کجا	میر سہ دیکھ آئینہ کو یار ہوا گو نازکا خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
نظام سہ گفتہ نا بہت ار سنے درشمار مرا نام کے بود سے آمرزگار	ناظم سہ آمادہ عفو پر تو خدائے غفور تھا کرتا نہ میں گناہ تو میرا قصور تھا
علی حزین سہ تا چشم تو زہ کردہ کمان را بہ کشیدنے یک صید نیا سود ز ناخنے بہ تپیدنے	سودا سہ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
ناظم سہ چند از شیخ گر مطلب ہست تا صبح را دل الفت [illegible] از من کنارہ من	شناتی سہ شکوہ ترکی [illegible] کا کہہ تیری آستین [illegible] سے بھر گئی

۴۰۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ و توارد'' ص ۱۵۸، ایضاً

۴۱۔ ایضاً ص ۱۵۷

۴۲۔ ایضاً ص ۱۵۸ تا ۱۵۴

۴۳۔ الناظر مئی ۱۹۹۹ء بحوالہ، ماہنامہ مہر نیم روز، مئی ۱۹۵۶ء کراچی

۴۴۔ پنڈت برج موہن کیفی ''منشورات'' پہلے ایڈیشن پر نوٹ، ص ۵۔۴

۴۵۔ علی اکبر قاصد ''ضدی'' مشمولہ مہر نیم روز، مارچ ۱۹۵۶ء کراچی۔

۴۶۔ ڈاکٹر ممتاز حسن ''مقالات ممتاز مرتبہ شان الحق حقی، ص ۴۵۸ تا ۴۵۳، ادارہ یادگار غالب کراچی، [۱۹۹۵ء بار اول]

۴۷۔ ڈاکٹر حبیب الحق ندوی ''اطالوی بیداری'' ص ۳۹۲، ۳۹۶ جریدہ شمارہ ۲۷

۴۸۔ پروفیسر رے می کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر'' مترجم ڈاکٹر ریاض الحسن ۱۹۶۷ء گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی

۴۹۔ ممتاز حسن ''مقالات ممتاز'' ایضاً ص ۴۴۵۔۴۴۴

۵۰۔ پروفیسر علی محسن صدیقی ''تاریخی مقالات [قرطاس کراچی]'' ص ۴۹۹ تا ۵۰۹ [طبع اول ۲۰۰۴ء]

۵۱۔ یہ معلومات جناب خالد اسحاق صاحب کے شیر مذہبی امور جناب طاہر کی صاحب نے مہیا فرمائیں۔

۵۲۔ ''یعقوب حسن'' ''کتاب الہدیٰ'' مدراس ۱۹۲۶ء دیباچہ سید سلیمان ندوی اصلاً یہ کتاب مولانا ابوالجلال ندوی کی ہے۔ یعقوب حسن صاحب ملکی سیاسی آدمی تھے۔ کانگریس سے وابستہ تھے علمی کاموں سے دلچسپی تھی اور اہل علم کی بھرپور سرپرستی کرتے تھے۔

۵۳۔ ابوالجلال ندوی، کتاب الهُدی، ص ۱۷، [طبع اول بمبئی ۱۹۲۶ء]

۵۴۔ ڈاکٹر محمد صادق آب حیات کی حمایت میں، ص ۱۸۷،۱۹۷۳ء لاہور

۵۵۔ قاضی عبدالودود کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام، مطبوعہ مہر نیم روز، اکتوبر ۱۹۵۶ء

۵۶۔ ڈاکٹر محمد صادق ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص ۵۷۔۴۷

۵۷۔ اسلم فرخی ''محمد حسین آزاد'' مشمولہ بازیافت ۳، ص ۳۰، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج۔

۵۸۔ سرقے کی اس واردات کے بارے میں ڈاکٹر جعفر احمد ناظم مرکز مطالعہ پاکستان جامعہ کراچی نے راقم کو معلومات مہیا کی تھیں اور ''تاریخ جماعت اسلامی'' آباد شاہ پوری حصہ دوم اور ترجمان القرآن ابوالاعلیٰ مودودی نمبر دو جلد سے رجوع کرنے کے لیے کہا تھا لیکن وقت کی تنگی کے باعث ان مصادر سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔

۵۹۔ صادق الخیری کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ اپریل ۵۶

۶۰۔ ڈاکٹر نثار فاروقی کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ خاص نمبر ۱۹۵۶ء

۶۱۔ مکاتیب نامہ مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید، ص ۸۶، علی گڑھ ایجوکیشنل پبلی کیشنز بحوالہ بازیافت ۳

۶۲۔ شاہ حسن گردیزی، تجلیات مہر انور، ص ۵۵۲ تا ۵۶۷، مکتبہ مہریہ گولڑا شریف اسلام آباد [بار اول ۱۹۹۲ء]

۶۳۔ محمود علی کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء

۶۴۔ طارق حبیب یوسفیات، ص ۲۲۷۔۲۱۸، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد [۲۰۰۳ء بار اول]

۶۵۔ طارق حبیب ''یوسفیات'' ص ۲۱۴ تا ۲۱۰، ایضاً

۶۶۔ اسلم فرخی ''محمد حسین آزاد'' مشمولہ بازیافت شمارہ ۳، ص ۳۳۔

۶۷۔ ایضاً ص ۵۳۔

۶۸۔ ڈاکٹر محمد صادق ''آب حیات کی حمایت میں'' پیش لفظ

۶۹۔ ڈاکٹر محمد صادق ''محمد حسین آزاد احوال و آثار

۷۰۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ''محمد حسین آزاد'' مشمولہ بازیافت، ص ۶۳

۷۱۔ ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ ''عصری ادب اور سماجی رجحانات''، ص ۶۳، ۶۲، اکادمی بازیافت کراچی [اشاعت اول ۲۰۰۳ء]

۷۲۔ حسن مثنیٰ ندوی ''کچھ یادیں کچھ باتیں''، ''ابلاغ''، شعبۂ ابلاغیات، مئی ۱۹۹۶ء جامعہ کراچی کا مجلہ، ص ۹۷ تا ۹۵۔

۷۳۔ ''چہ دلاور است'' مولانا حسن مثنیٰ کی زندگی میں مرتب کر دی گئی تھی۔ مولانا اس پر مقدمہ لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ان کے چچا زاد بھائی ابوالانشاء نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ یہ معلومات غیر مطبوعہ پیش لفظ سے لی گئی ہیں۔ چہ دلاور است کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے جس میں یہ پیش لفظ بھی شامل ہوگا۔